دیوان صفی

مع

خلاصہ مقدمات

(۱) ممتاز حسین جونپوری

(۲) مرزا جعفر علی خاں اثر

(۳) سید کلب عباس نقوی

(۴) علامہ اختر علی تلہری

(۵) سید احتشام حسین ایم، اے

(۶) سید شہنشاہ حسین صاحب ایم، اے
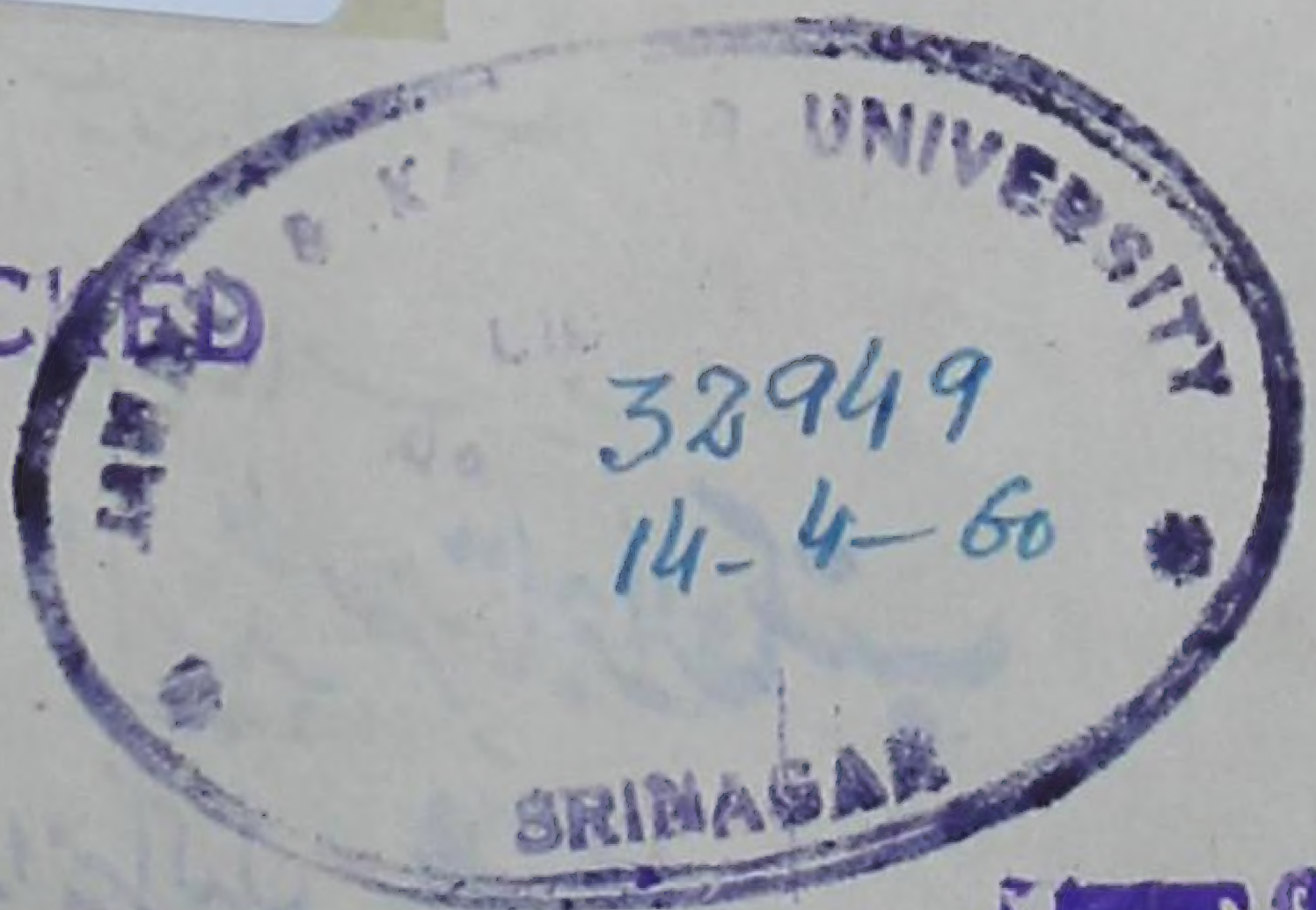
لسان القوم مولانا سید علی نقی صاحب صفی لکھنوی
مرحوم اعلی اللہ مقامہ

عکسِ تحریر و دستخط مولانا صفی مرحوم

قطعہ

غبارِ کاروانِ انبساط ایسی

برائے نام دیکھنے والے ایسی

عیاں ہے جو شکستِ آرزو سے

سحر جب بے نور تاروں کی

یہ تصویر

صفی

عرضِ ناشر

مولانا صفی ۳؍جنوری ۱۸۶۲ء کو پیدا ہوئے اور تقریباً ۹۰ سال تک پہنچتے پہنچتے ۲۵؍جون ۱۹۵۰ء کو فوت ہو گئے۔ ان کے شعر و سخن کی مدت ۷۶ سال کی تھی۔ ۱۸۷۷ء کے پہلے سے شعر کہتے تھے مگر اس مجموعے میں ۱۸۷۵ء سے غزل کے اشعار یکجا ہو سکے۔

مولانا نے ۱۸۷۷ء سے ۱۹۵۰ء تک اپنی شاعری کے آٹھ دَور قائم کیے ہیں۔ پہلا اور آخری دَور دس سال سے کم کا ہے باقی دس سالہ مردم شماری کی طرح دس دس سال کے دَور ہیں ممکن ہے کہ دس سال کا دَور اس لیے قرار دیا ہو کہ اس مدت میں زبان اور خیالات میں جو تھوڑا بہت تغیر ہوتا ہے اس کا اندازہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔

مولانا کی غیور طبیعت کو یہ خیال تھا کہ اپنے ہی پیسے سے دیوان چھپوایا جائے ایسا سامان ان کی زندگی میں نہ ہو سکا۔ ان کے لڑکے منظور علی وصی مرحوم کو بھی یہی خیال رہا۔ ان کے مرنے پر ایک قدیم نیاز مند کی حیثیت سے ان کے اس اصول کی خلاف ورزی کی ہمت نہ ہو سکی اس لیے قرض دام کر کے یہ مجموعہ چھپوانا پڑا۔

مولانا کے کلام کا بڑا ذخیرہ ان کے پوتے سید محمد احمد ایم، اے زیدی لیے ہوئے بیرونِ ہند چلے گئے۔ مولانا کے دو دیوان ان کے عزیز شاگرد پرنس کاظم علی مرزا قمر اور ان کے رفیق ہمدرد سید سکندر حسین کے پاس رہ گئے۔ یہ ان کا بڑا احسان ہے کہ اس کے ترتیب و طباعت کا کام بالکل میری ذمہ داری پر چھوڑ دیا۔ خیال یہ ہے کہ اگر کچھ بچ جائے تو صفی دارالمطالعہ میں لگا دیا جائے۔

یہ دیوان کی پہلی جلد ہے۔ بعض مجبوریوں کی وجہ سے بکثرت اہلِ ادب کی رائے ہوئی کہ جہاں تک زیادہ سے زیادہ ہوسکے دیوان کا انتخاب شائع کیا جائے چنانچہ میں بیحد شکر گذار ہوں کہ خان بہادر مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر، سید مسعود حسن صاحب ادیب علامہ سید اختر علی صاحب تلہری، جناب سالک صاحب، حکیم صفدر نواب صاحب اور سب سے آخر میں آل احمد صاحب سرور نے انتخاب اور ترتیب میں بڑی مدد دی۔ دیوان پر مقدمہ لکھنے کے لیے میں نے یہ طے کیا کہ مختلف ادیب خاص موضوع پر مولانا کی شاعری کے متعلق اپنے اپنے آزاد مرضی سے لکھیں تاکہ تنوع سے ادبی لطف پیدا ہو جو واقعات جہاں رہ گئے تھے، اور ایک عبارت کا دوسرے سے ربط اور جوڑ ملانے کے لیے کمخواب و زربفت میں گزی کا پیوند لگانے کی خدمت میں نے اپنے سر لی۔ ان لکھنے والوں کا بھی میں بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے میرا بہت ہاتھ بٹایا اور کام ہلکا کر دیا۔

ردیف وار غزلوں پر مولانا مرحوم اور میں نے پتہ لگا لگا کر سنہ تصنیف بھی لکھ دیا تھا۔ انتخاب میں مختلف مذاق والوں نے مختلف زمانے اور مختلف قسم کی تخیل کے اشعار رکھے ہیں تاکہ ادبی تاریخ اور ذوق اور شاعر کے ہر دَور کی نیابت ہو جائے۔ زمانے مدد کی تو جو کچھ کلام رہ گیا ہے آیندہ اس سے بھی اُردو ادب کو باردار کرنے کی صورت شاید نکل آئے۔

ممتاز حسین جونپوری

قومی گھر نادان محل روڈ لکھنؤ

مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۵۳ء

مقدمہ

شاعری خداوندی نعمت اور فطری عطیہ ہے لیکن شعر و شاعری کی عالم آرا کرنیں جتنے جھرونکوں سے ہو کر انسان کے دل و دماغ پر چمکتی ہیں ان میں سے ایک وہ رَوزن بھی ہے جس کی جگہ خاندان و نسل کے خون کے بہاؤ سے کبھی کبھی پھوٹ نکلتی ہے۔ مقامی فضا ہم جلیسوں کی صحبتیں گرد و پیش کے حالات و احساسات، علم و تعلیم و اکتسابات کو بھی شاعری کے گل بوٹے کھِلانے میں خاصا سلیقہ ہے۔

مولانا سید علی نقی صفیؔ لکھنوی کے ان سب سرچشمہائے شاعری کی جستجو میں جب ہم دُور دُور نظر دوڑاتے نکل جاتے ہیں تو واقعات و خیال کا قافلہ ہمیں پہلے خطۂ غزنی میں لے جاتا ہے جو صدیوں سے شعرا کا مامن تھا عسجدی عنصری اور کن کن غزنوی درباری شعرا کے نام گنائیں جو تاریخ ادب کی زینت ہیں۔ صرف محمود غزنوی اور فردوسی کا قصہ سامنے آکر غزنی کی تاریخ شاعری کی یاد سے رُلاتا نہیں نکل جاتا ہے بلکہ کچھ اور بھی شاعری کی دُکھ بھری کہانیاں تاریخ ادب کے دامن سے چپکے چپکے اپنے آنسو پونچھتی نظر آتی ہیں۔ مولانا صفیؔ کے مورث مبارک شاہ کی شاعری اور دیگر حالات کے بارے میں زیادہ معلوم نہ ہو سکا مگر اتنا تو معلوم ہے کہ اسی خطۂ غزنی کے شاعری کی فضا میں بڑے ہو کر وہ پلے اور دہلی کی عروج شاعری کے دَور میں کچھ آسرا لیے آئے۔ وہ سادات زیدی سے تھے اور تقدس شاعری کی نعمت سے اُن کا ادیب و ادب نواز خاندان محروم نہ تھا۔ مولانا صفیؔ نے اپنے مورث کی مختصر تاریخ یوں نظم کی ہے ؎

عیسیٰ بن زید حضرت شہزادۂ حسین ہیں دونوں زید ابن علی کے یہ نورِ عین

شہزادہ حسین کا ذوالدمعہ ہے لقب — منسوب انھیں سے غزنویوں کا حسب نسب
غزنی سے آئے شاہ مبارک جو سوئے ہند — خاکِ قدم سے ان کے بڑھی آبروئے ہند
دہلی میں ان کا نام ونشاں برقرار ہے — بالائے حوض شمسی ابھی تک مزار ہے
پنگوڑیوں کے مورث اعلیٰ بڑے ولی — اولاد میں انھیں کے ہیں سید جلال بھی
شاخیں جدا جدا ہیں مگر ایک ہے چمن — اجداد کا ہمارے تھا پنگوڑہی وطن
بھائیوں کے تیغ ظلم سے جب خوں میں نہائے — چھوڑا وطن بزرگ ہمارے اودھ میں آئے
دل سے قریب گو کہ بظاہر بعید ہیں — ہم بھی چراغ مشہدِ زید الشہید ہیں

مولانا صفی کے والد سید فضل حسین صاحب خود بھی فاضل و عالم تھے لکھنؤ کے محلہ مولوی گنج میں آخری تاجدار اودھ کے بھائی شہزادہ سلیمان قدر بہادر کی محل سرا کے قریب رہتے تھے اور اسی سرکار کے معتمد تھے اسی وجہ سے صفی صاحب بھی شہزادہ ادب نواز کے بیٹے شہزادہ ثریا قدر بہادر کے ساتھ رہے اور ایک ہی مکتب شاہی میں پڑھے اور پروان چڑھے۔ اس سرکار سے کتنے ہی شاعر وابستہ تھے اور دربار کا سدا بہار ماحول علم ادب اور شاعری سے مدتوں ہم آغوش رہا۔ عربی، فارسی، انگریزی اور ٹکسالی اُردو میں صفی نے کمال حاصل کیا۔ شادی ہوئی تو علی میاں صاحب کامل کے ذی علم بدیگوار اپنے خسر اور ان کے ادب نواز گھرانے کی صحبت نصیب ہوئی۔ ہم نے اس مسئلہ کو خود مولانا سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ علی میاں صاحب کامل یا کسی سے ان کو شاعری میں تلمذ نہ تھا اور جیسا کہ ان سے پوچھ پوچھ کر ان کی لاجواب قومی نظم لخت جگر اور صحیفۃ القوم کے دیباچہ میں ذرا کچھ تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

۱۔ مرزا جعفر علی خاں اثر | لکھنؤ میں جہاں کہیں مشاعرہ ہوتا تھا اس میں پڑھنے کے لیے صفی صاحب اپنے بعض بعض شاگرد طلباء کو غزل کہہ کر دے دیا کرتے تھے اور ان سے پوچھتے تھے کہ مشاعرے میں سامعین نے کس شعر کو زیادہ پسند کیا۔ اس طرح اپنے شعر کی حیثیت کا موازنہ کرکے

اس سے بہتر کہنے کی سعی کرتے تھے بالفاظ دیگر خود ہی اپنی شاعری کی اصلاح و پرداخت میں منہمک رہتے تھے۔ سب سے پہلی مرتبہ شاہزادہ سلیماں قدر بہادر کے داروغہ اچھے صاحب کے یہاں شریک مشاعرہ ہو کر نوجوان صفیؔ نے غزل پڑھی جس کی بڑی دھوم ہوئی۔ پھر دوسرے مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ ۱۸۸۳ء سے اودھ کے محکمۂ دیوانی میں مستقل ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ملازمت کے سلسلہ میں زیادہ تر پرتاب گڑھ۔ رائے بریلی اور سلطانپور میں رہے اور خصوصیت سے رائے بریلی کے شہزادہ باسدیو سنگھ صاحب کے مشاعروں سے ان کی شاعری کی دھاک بندھ گئی۔ جہاں کے مشاعرے کا ایک شعر ہے ؎

بزم ساقی میں ذرا ہشیار بیٹھیں آج مست کل یہیں پہلو سے میرے شیشۂ دل اٹھ گیا

۱۸۸۹ء میں محلہ زہی لکھنؤ کے نواب سید اصغر حسین صاحب فاخر مرحوم کے یہاں بڑے اعلیٰ پیمانے پر مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ان میں باکمال شعرا شریک ہوتے تھے۔ ان مشاعروں میں صفیؔ صاحب نے خوب خوب غزلیں پڑھیں جبھی سے کلام کی شہرت ہوئی۔ ان غزلیات کے بعض شعر یہ ہیں ؎

سنتے ہیں قافلے میں سبھی نالۂ جرس لیکن کوئی غریب کا فریاد رس نہیں
صیاد کچھ تو میری طرف سے ہے بدگماں بے وجہ رخنہ بندی چاک قفس نہیں

سلوک ایسا تو کر جس سے جہاں میں نام روشن ہو
چراغ راہ بن جا دوست اس میں ہو کہ دشمن ہو

نامہ قاصد کو دیا پھر لے لیا یہ سوچ کر خط پڑھے گا کون پیغام زبانی چاہیئے

گلشن میں بہار آئے خزاں آئے ہمیں کیا ہے ایک کلی دل کی وہ مرجھائی ہوئی ہے

وہ رند ہیں جنھیں مئے و معشوق ہے نصیب ۔۔۔ وہ پارسا ہیں جن کو یہ ساماں بہم نہیں

دل پریشاں بھی نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا ۔۔۔ سخنِ واعظِ آشفتہ بیاں کیا سُنتے

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان اشعار میں کس قدر خلوص و صدق کا اظہار ہے اور بنوٹ سے کوسوں دُور ہیں اور یہ ۱۸۸۹ء کی بات ہے جب چند قابل احترام مستثنیات سے قطع نظر اس زمانے کی لکھنوی شاعری (غیر لکھنوی بھی) تناسبات لفظی کا گھروندا بن کر رہ گئی تھی۔ لفظی صنعت گری کی دھن میں جذبات سے مغائرت ہوگئی تھی۔ کوئی بعید از قیاس بات فرض کرلی اور اس کو محض سطحی مشابہت سے ثابت کردکھایا۔

یہ حضرت صفی کی شاعری اور اس شاعری کی شہرت و مقبولیت کا فیض ہے کہ انجمن معیار ادب اور رسالہ معیار کی بنیاد رکھی گئی اور لوگ شاعری میں حقیقت نگاری و ترجمانی جذبات کی طرف مائل ہوئے۔ جو اشخاص (مثل صفی) انگریزی زبان سے واقف تھے انھوں نے اس تحریک کو مزید تقویت پہنچائی۔ ان میں نمایاں حیثیت مرزا محمد ہادی رسوا مرحوم (مصنف ناول امراؤ جان ادا) کی تھی...... حضرت صفی نے غزل کے علاوہ اور صنف نظم میں بھی ایک عظیم و خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا"۔

صفی کی وضعداری مزاج و مزاح

مولانا صفی بڑے محتاط نیک چلن، فیاض طبع اور رحیم تھے۔ ان کے بعض باطنی صفات کا ذکر ذیل کی نظم میں ہے۔ ظاہری وضع تصویر سے اور کردار کی فہرست ان کی شان خط سے جو اسی مجموعہ میں ہے ظاہر ہوگی مگر اس کے لیے علم قیافہ شناسی اور علم فراست الید سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔

سید کلب عباس نے مولانا کی ایک خاص عادت اور حالت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے

"کسی وقت بھی کوئی جائے مولانا کو کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے وہ پاتا تھا۔ اکثر وہ مطالعہ میں اتنا مستغرق رہتے تھے کہ جب تک بالکل قریب نہ پہنچ جانے آنے والے کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے مگر جب آنکھ پڑ جاتی تو ان کا شگفتہ چہرہ پھول کی طرح متبسم ہو جاتا اور چمکتی ہوئی پُر بصیرت آنکھیں اس طرح ٹکٹکی لگا تیں کہ گویا انھوں نے نو وارد کو کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ مولانا بڑے منکسر مزاج، متواضع اور خوش خلق تھے لیکن حد درجہ کے خود دار تھے ...."

اب یہاں سے مولانا کی وضعداری اور مزاج کے بارے میں میری بات سُنئے:۔

مولانا نے لباس اور وضعداری میں ایک طرح پر ساری زندگی گزار دی۔ وہی شیروانی وہی قمیص اور چھوٹی مُہری کا پائجامہ۔ ایرانی یا پُرانی وضع کی ٹوپی پہنتے تھے۔ انھوں نے مینا کی چونچ والی ٹوپی کا اڈا اپنے سر کو سیاسی شکار کے لیے کبھی نہیں بنایا۔ عربی، فارسی اتنی زیادہ پڑھی تھی کہ صحیح طور پر وہ مولانا کہے جانے کے سزاوار تھے۔ وہ شاعری والے مولانا نہ تھے اور گاؤں کے کسانوں اور کنجڑے، کبڑیوں کے اصطلاحی اور بے مغز لفظی اور حقیقی معنی سے معرا مولانا بھی نہ تھے۔ عربی تعلیم کے صلہ رحم کی خاطر دھوکے دھڑی کی دوکان سے لاکر علمائے سوا کو سٹھارنے کے لیے جبہ و دستار جو حضرت آدم کی رقیب مخلوق بطور ہدیہ پیشکش کرتی رہتی ہے اس کی تاکہ بندی مولانا صفی کی انگریزی دانی تمام عمر کرتی رہی۔ مولانا کی طبیعت میں بڑا خوشگوار مزاج تھا۔ اگر ان کی زندگی کے لطائف و ظرائف کا ذکر چھڑ جائے تو یہ دنیا معانی لگاں کا کشت زعفران زار بن جائے اور شاعری کے ذکر سے اس مقدمہ کو فارغ خطی لکھنا پڑے۔ یہی سمجھئے کہ اگر مولانا کی طبیعت میں اتنا ستھرا ذوق مزاح نہ ہوتا تو اپنے چھوٹے بھائی ظریف مرحوم کے اس شعر پر مناسب اصلاح دے کر ادب قدیم اور ادب جدید کی مہذب و عدیم المثال تعریف کا سرمایہ دار اور صرف اس ایک شعر کو تاریخ ادب کا سر لوح بنا دینے میں کامیاب نہ ہو سکتا ہے

وہ مری خواہش وصل ان سے بہ تخئیل جدید
وہ بہ تخئیل قدیم ان کا گریزاں ہونا

مولانا کی مشہور اخلاقی مثنوی "تنظیم الحیات" میں جو چین کے ڈلائی لاما کے پیغمبرانہ اقوال کا اُردو منظوم و معجز نما ترجمہ ہے اور جس تصنیف پر مولانا کو اُردو اکاڈمی سے پانچسو روپیہ انعام ملا تھا۔ مولانا کی خوش طبعی اور لطیف ادب میں سموے ہوئے مزاح کے کہیں کہیں نمونے بے ساختہ نمودار ہو گئے ہیں اور اللہ میاں کی بزرگی اور توحید کے خشک مسائل سے اُکتا جانے والوں کے لیے خدا کی ادنیٰ مخلوق تتلی والی نظم کو چمن ادب کے ایک گوشے سے پھر سے اُٹھا کر اور اس کے پروں کی طرح فطری شاعری کا رنگ بھر کر اس طرح لطیف ذوق کو دعوت دی ہے اور پڑھنے سے بھاگنے والے طفل گریز پا کی طرح مکتب درس و عرفاں میں پھر سے گھیر کر اس طرح روٹھے ہوؤں کو لائے ہیں کہ یہ مولانا کے کمال شاعری اور شگفتگی کے مزاج شناسی کی دلیل ہے۔ غزل میں بھی کبھی کبھی مولانا کی خوش مزاحی یوں پھوٹ نکلتی ہے ؂

دور میں ہم تک بھی اک جام شراب آہی گیا
ہم نشینی غیر کی اس بزم میں کام آگئی

صفیؔ کا کردار و صفات

(از خان بہادر مرزا جعفر علی خاں صاحب اثرؔ)

وضع صفیؔ نہ پوچھو اک رند پارسا تھا
بیگانہ بھی تھا سب سے پھر سب سے آشنا تھا

خلقِ خدا کی خدمت مقصد حیات کا تھا
اس کے سوا نہ کوئی مطلب نہ مدعا تھا

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا
اس نے وہ کر دکھایا حافظ جو کہہ گیا تھا

بدلہ بدی کا نیکی دشمن کو دینے والا
اس منزلت کا شاعر کیا کوئی دوسرا تھا

تھی اس کی ذات والا مجموعۂ فضائل
آئینۂ صفا تھا گنجینۂ وفا تھا

خلق حسن نے اس کے مل کر فردتنی سے
ہر کہ و مہ کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا

صدق و خلوص و ایثار اس کی سرشت میں تھے — جو قول یا عمل تھا بے ریب و بے ریا تھا
ظاہر سے تھی زیادہ باطن کی تابناکی — عارف تھا خود نگر تھا صالح تھا باخدا تھا
غیرت کی پاسداری شیوہ تھا اس جری کا — ایماں حیا کو سمجھا وہ صاحب حیا تھا
صہبائے ناب جیسے جام بلوریں ہو — انسانیت کا جوہر اس سے جھلک رہا تھا
میخانۂ ولا کے مینا بدوش ساقی — رندوں کو ناز تجھ پر جتنا بھی تھا بجا تھا
نازاں ہیں سب زباں پر تجھ پر زباں تھی نازاں — رنگ سخن کچھ ایسا تو نے بدل دیا تھا
دکاں تھی جوہری کی یا تیری نظم رنگیں — انواع کا جواہر جس میں سجا ہوا تھا
نقاش حرف و معنی صنعت گری سے تیری — جو لفظ جس جگہ تھا اک نگ جڑا ہوا تھا
الفاظ میں بلا کی طاقت بھری ہوئی تھی — یہ امتزاج دلکش حصہ فقط ترا تھا
وہ تیری بذلہ سنجی وہ تیری خوش نوائی — پڑھتا تھا تیرا کلمہ پڑھتے جو سن چکا تھا
اصناف شاعری میں اک طرز نو کا مالک — جو تجکو جانتا تھا وہ تجکو مانتا تھا
شعر و ادب کی محفل سونی تھی لکھنؤ میں — ایسی رندھی فضا میں تو شمع پرضیا تھا
لیکن یہ اپنی حالت قدر کلام کیسی — تیرے کمال فن سے انکار برملا تھا
ماضی میں جینے والے کیا تیری قدر جانیں — تو حال کا مغنی فردا کا رہنما تھا
شیدائے ملک و ملت تجھ پر خدا کی رحمت — پہلو میں تیرے دل تھا اور درد آشنا تھا
جنت کے اے مسافر تجکو نصیب جنت — اس دکھ بھرے جہاں سے دل تیرا بھر گیا تھا
تو جوہری میں ہوں ذرہ لیکن تو ہی ہے شاہد — تار شعاع بن کر میں تجکو دیکھتا تھا

وہ لطف خاص تیرا اب تک ہے نقش دل پر
جو ہے وصی اثر ہے کس پیار سے کہا تھا

صفیؔ بہ حیثیت شاعر

ادیب زمانہ علامہ سید اختر علی صاحب تلہری نے یہ لکھا ہے کہ" جناب صفیؔ لکھنوی انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے ایک مسلم الثبوت شہرۂ آفاق نغز گو شیدا بیان شاعر تھے۔ ان کے زمزموں میں رس تھا۔ ان کے لہجے میں شیرینی تھی۔ تقریباً ۵۰ سال تک انھوں نے مسلسل شعر و ادب کے باغ کی آبیاری کی۔ اپنے خون جگر سے اسے سینچا ہے"۔

سید کلب عباس صاحب نقوی نے مدتوں مولانا صفیؔ کی شاعری پر نظر کی ہے انھوں نے بھی اسی سے ملتے جلتے الفاظ میں تحریر فرمایا ہے کہ" مولانا صفیؔ انیسویں بیسویں صدی کے دور وسطیٰ کے ممتاز ترین شاعر ہیں اور ایسے شاعر کو ایک دور ایک ہی مرتبہ پیدا کرتا ہے۔ مولانا صفیؔ علوم مشرقی کے منتہی تھے اور ان کے تبحر علمی نے ان کی خداداد شاعری کو چار چاند لگا دیے تھے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مولانا اپنے وقت کے عروض و معانی کے بڑے ماہر و کامل تھے۔ ان کا وسیع مطالعہ جو کتب سیر و تاریخ و ادب و معانی کا تھا صرف اُردو پر محدود نہ تھا بلکہ فارسی، عربی اور انگریزی ادب تک چھایا ہوا تھا۔ ان کی زندگی کی بہترین دقیق کتابیں تھیں اسی وجہ سے ان کے ادبی اور قومی خدمات کی بے مثل یادگار ہندوستان کے قدیم اخلاقی، تعلیمی انجمن آل انڈیا شیعہ کانفرنس نے ایک عظیم الشان عمارت موسومہ قومی گھر لکھنؤ میں صفی دار المطالعہ اور پبلک کتب خانہ بلا لحاظ قوم و ملت ہر بنی انسان اور رفاہ عام کے لیے قائم کر دیا ہے .... مولانا کی خود داری یہ تھی کہ خود سے شعر سننے کی کبھی فرمائش نہیں کی"۔

ان کی قومی نظموں میں بلا کا تغزل اور اثر ہوتا تھا ..... اوقات غفرانمآب کے مقبرے کی کس مپرسی پر ۱۹۰۰ء کی ان کی قومی نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں جس میں کوٹ کوٹ کر

رنگ تغزل بھرا ہوا ہے ؎

ہم اپنا درد دل رو رو کے بیتابانہ کہتے ہیں
الٰہی خوش رہیں وہ جو ہمیں دیوانہ کہتے ہیں
اسی شہر خموشاں میں جسے ویرانہ کہتے ہیں
سنو ذرّے زبانِ حال سے افسانہ کہتے ہیں
نظر ان پر نہیں اے قوم جو تیرے فدائی ہیں
اسے بھی ہم ترا اک نازِ معشوقانہ کہتے ہیں
ہماری زندگی بھی کیسی عبرت خیز تھی یارب
کہ جس کے حال کا افسانہ گو افسانہ کہتے ہیں
کبھی گورِ غریباں کی طرف بھولے سے آنکلو
اس آبادی کو بھی دیکھو جسے ویرانہ کہتے ہیں
کہ جہاے کیسے گستاخ کرد آخر صفیؔ مارا
جو وہ افسانہ سنتے ہیں تو ہم افسانہ کہتے ہیں

صفیؔ کی شاعری پر جو معرکۃ الآرا مضمون سید کلب عباس صاحب نے لکھا ہے اور جس استدلال و شواہد سے اس کو مثال دے کر مضبوط کیا ہے اسی کے ساتھ ہی ساتھ ان کی قومی نظموں کے مطبوعہ مجموعے "صحیفۃ القوم" اور "لخت جگر" سے پتہ چلتا ہے کہ قومی نظم اب تک صفیؔ سے بہتر کم از کم اُردو زبان میں کسی قوم و ملت کے کسی شاعر نے نہیں کہی۔ افسوس ہے کہ یہ غزلوں کے دیوان کا مقدمہ ہے اس لیے اور صنف شاعری کا ذکر تشنہ چھوڑ دیئے اور طوالت سے بچنے کے سوا چارہ نہیں ورنہ صفیؔ کی شاعری کے بہترین نمونے ہر صنف کے مطبوعہ اور بہت کچھ غیر مطبوعہ موجود ہیں اور ان میں قومی، اخلاقی، نیچرل، سیاسی نظمیں۔ قطعات تاریخ۔ دہر آشوب۔ مرثیہ۔ سلام۔ رباعی۔ نوحہ۔ قصائد۔ انگریزی، فارسی نظموں کے تراجم۔ ان کی زندگی کا شاہکار ترجمہ رباعیات عمر خیام۔ منظوم سوانح عمریاں۔ مثنوی۔ مسدس۔ مخمس۔ صفیؔ و کاملؔ کی طرح کی تضمین۔ ترکیب بند۔ ترجیع بند سب ملا کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ ایک لاکھ سے زیادہ اشعار ہوں گے اور ادب اُردو میں بعض نئی صنعتوں کی ایجاد مثلاً مثنوی چراغ دیر میں دوہری صنعت براعت استہلال۔ تین مصرعوں کی موسومہ نظم شرابِ مثلث میں ایجادات اور مصرعوں کی ترکیب یوں ہے ؎

بحر یورپ وہ تری آغوش کا پالا جہاز — جا رہا ہے کھیلتا پانی سے متوالا جہاز
دولتِ برطانیہ کا نامور اعلیٰ جہاز

مولانا صفیؔ ایک مکمل اور شاعری کے رموز کے عالم باعمل شاعر گزرے ہیں جس پر اُردو زبان کو ناز ہے۔ مولانا صفیؔ کی شش سالہ جانکاہ محنت اور کمال کا نمونہ "رباعیاتِ عمر خیام" کا اُردو میں لاجواب منظوم ترجمہ ہے:۔

رباعی عمر خیام	ترجمہ صفیؔ
آمد سحرے ندا ز میخانہ ما	میخانے سے آئی یہ دمِ صبح ندا
کاے رند خراباتی و دیوانہ ما	اے رند خرابات ہمارے شیدا
برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ ز مے	اُٹھ جام کو تیرے مے سے کردیں لبریز
زاں پیش کہ پر کنند پیمانہ ما	قبل اس کے کہ پیمانہ ہو لبریز اپنا

مولانا صفیؔ نہ صرف شاعر تھے بلکہ اپنے عہد کے باکمال اُستاد تھے۔ آخر عہد میں جب رفتہ رفتہ تمام باکمال لکھنؤ سے اُٹھ گئے تھے تو صرف صفیؔ باقی رہ گئے تھے جو تنہا مستند اور مسلم الثبوت مانے جاتے تھے۔ پیارے صاحب رشیدؔ جناب عارفؔ صاحب کی طرح دُور دُور تک شعرا ان کے زبان دانی، فنی اجتہاد اور کمال کے قائل تھے اور خود میرے استفسار پر ان حضرات اور ڈاکٹر مرزا محمد ہادی صاحب رسواؔ نے مولانا صفیؔ کے مستند اور باکمال ہونے کی تصدیق فرمائی۔ پنڈت برج نرائن صاحب چکبست اور آخر عہد کے تمام خوشگو شعرا مولانا صفیؔ کو مستند شاعر مانتے تھے۔ صفیؔ اہل زبان تھے اور ان کو اپنی زبان دانی پر بجا ناز تھا

خاص اردوئے معلیٰ ہے صفیؔ جس کا نام
یہ زبان اب نہ رہے گی بخدا میرے بعد

صفیؔ تا حیات لکھنؤ کے غزل گو شعرا کی مشہور ادبی انجمن "معیار و بہار ادب" کے صدر رہے اور زبان اور فن کی جس قدر مشکلات لکھنؤ اور باہر والوں کو پیش آتی تھیں

ان کو حل کرتے تھے۔

قومی نظم

اس مقدمہ میں صفی کی شاعری کا ذکر ممکن نہیں۔ صرف قومی نظم اور شاعری کا ذکر جملہ اصناف سے بطور اقتباس کہیں کہیں سے سید کلب عباس صاحب نقوی کے مضمون سے سرسری طور پر پیش کیا جاتا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ غزل کی تشبیہیں، استعارے اور دیگر رنگینیوں سے صفی قومی نظموں کو مرتب اور آراستہ کرنے کا کتنا زبردست شاعرانہ سلیقہ رکھتے ہیں۔ صفی کی معرکۃ الآرا "لخت جگر" کی نظمیں یا "لخت جگر" کے سالگرہ کی گرہیں ایک دوسرے سے اتنی مربوط اور پیوستہ ہیں کہ ان کو اگر اکٹھا کرکے پڑھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ زمانے کے تغیرات کا ایک گراف (شرح) ہے یا قومی زندگی کا ایک آلہ مقیاس الحرارت جس کے خطوط ابنائے ملت کی نبض کے اُتار چڑھاؤ کو بتلاتے ہیں مگر جو خاص خصوصیات صفی کی اس قومی نظم میں نظر آتی ہیں وہ کسی اور کی قومی نظم میں نہیں۔ قومی نظمیں اکثر گھن گرج شکوہ الفاظ اور بلاغت معنی سے معرا ہوتی ہیں۔ اور جو ایسی نہیں ہوتیں، وہ غیر مقبول ہوجاتی ہیں۔ صفی مرحوم کی اس نظم میں لطف بیان زبان بلندی خیال شکوہ الفاظ سب کچھ موجود ہے۔ بیان میں زور، اختصار میں تفصیل، واقعہ نگاری میں مصوری، اظہار حقیقت میں اثر، شکوے میں خلوص، شکایت میں واقفیت، اپیل میں درد، تعلّی میں جوش، قومی رجز میں قوت، یہ سب عدیم المثال محاسن موجود ہیں۔ زبان میں سادگی اور سادگی کے ساتھ نگینہ کا جیسا میل دار جڑاؤ اور برمحل الفاظ کا استعمال اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے روزمرہ یا ٹھیٹ ہندی یا بھاشا کے لفظوں اور محاوروں کی کھپت کہ ان کا نظم ہی ہونا ان کے محل صرف کو واضح کردے یہ مولانا صفی کا حصہ تھا۔ اسی طرح تضمین اور گرہ لگانا بھی ان کا حق تھا۔ دوسرے کے اشعار اپنے شعروں میں ایسا ضم کردیتے تھے کہ اپنا کرلیتے تھے۔ مناظر کی تصویر کشی۔ آثار قدیمہ کی نقشہ نویسی، باشندوں کی معاشری زندگی کی مصوری اور مذموم مراسم و تعصبات قبیح کی بیخ کنی مولانا کے کلام کے طرۂ امتیاز تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہر نظم ترنم اور ترانہ کے تموج سے بھری ہوئی ہے ..... "ساقی نامہ کو
پہلے پہل قومی نظم میں مولانا نے پیش کیا۔ مقامی جغرافیہ و تاریخی حالات کا ذکر قومی نظموں میں
کرنا مولانا صفی کی ایجاد ہے جس کے لیے اپنی نظم "لخت جگر" میں خود مولانا صفی نے یوں
فرمایا ہے ؎

نظم میں تاریخی و جغرافیائی پٹریاں اس چمن بندی کا موجد میں ہوں واقف ہی جہاں

بوجہ طوالت مثالیہ اشعار ترک کیے جاتے ہیں۔ زندگی کے صدہا مسئلوں اور تجویزات
سے صفی کی قومی نظمیں لبریز ہیں۔ صفی نے اپنی غزل میں بھی مسائل حیات کو استعمال کیا ہے
مگر عمداً کم کم۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصولاً غزل کو اس سے محفوظ رکھنا پسند کرتے تھے۔
سید کلب عباس صاحب نے سوچنے کے لیے یہ راستہ پیدا کر دیا ہے کہ قومی نظموں میں
مولانا صفی نے تغزل کا رنگ اتنا بھر دیا ہے کہ غزل کا ایک نیا مصرف نکل آیا۔ عکاظ کے
میلوں میں باکمال عرب شاعر دو لڑنے والوں کے بیچ میں کھڑے ہو کر شاعری کے زور اثر سے
میل ملاپ پیدا کرتے تھے۔ بارہا صفی نے اپنی نظم سے یہی کام لیے۔ ایک بار دو گروہ
برسر پیکار تھے اور سمٹ سمٹ کر قومی جلسے میں ایک دوسرے کے رقیب بن کر زور آزمائی کو
آئے۔ صفی نے اپنی ذات کو مرکز درد و غم قرار دے کر پہلے تو ان کی توجہ یوں مبذول کی ؎

ہم آج اس بزم میں اک آہ پُر تاثیر کھینچیں گے جو دل میں دیر سے پیوست ہے وہ تیر کھینچیں گے

تغزل کا رنگ دیکھنے کے لیے بھول جائیے کہ یہ کوئی قومی نظم ہے۔ بزم دوست میں
ذرا چلے چلیئے۔ عاشق کے دل میں نگاہِ ناز کا تیر مدتوں سے چبھا ہوا ہے۔ معشوق کا تغافل
بہت بڑھ گیا ہے۔ رقیبوں پر نظر التفات ہے۔ آج عاشق یہ ٹھان کر بزم محبوب میں آیا
ہے کہ اس تیر نظر کو چل کر بھری بزم میں نکالیں گے۔ اب پھر اسی جگہ آجائیے جس بزم میں
لڑنے والوں کی پُر خلش اور دل دوز باتوں سے جو تیر دلِ دردمند میں بہت دیر سے پیوست ہے
اس کو سب کے سامنے ایک آہ پُر تاثیر کھینچ کر پھر دل سے کھینچنا ہے۔ تیر اور آہ کی مشابہت سے

جو شاعرانہ مصوری کی گئی ہے وہ بھی جان تغزل ہے۔ یہ تو ابھی دل کو نرم کرنے کے لیے کہا ہے
اس کے بعد کی واقعہ نگاری دیکھئے۔ دو پہلوان قومی اکھاڑے میں اُتر چکے ہیں زور آزمائی
کے لیے سامنے قومی زنجیر ہے۔ زنجیر کشی ٹھن گئی ہے جس میں عکاظ کے میلے کے رنگ کا متوالا
شاعر صفی غزل کے سُر کی سریلی بانسری بجاتا اسٹیج پر آکر للکارتا ہے ؎

نہ ٹوٹیں اتحادِ باہمی کی خوشنما کڑیاں
سُنا ہے قوم کے زور آزما زنجیر کھینچیں گے

زنجیر کی کڑیوں سے پہلے آہنی کا لفظ سامنے کا تھا اسے شاعر چھوڑ کر خوشنما کا لفظ
چُنتا ہے کیونکہ شعر اور واقعہ کی حالت سے ذہن خود مضبوطی کے اظہار کے لیے آہنی کے قسم کا
لفظ تصور کرے گا۔ شاعر کو قومی زنجیر کی خوشنما اور خوبصورت کڑیوں کی بربادی کا نقشہ پیش
کرکے اپیل میں مدد لینا ہے۔ خوشنما عمارت کے ڈھانے کا ایک خاص اثر دل محسوس
کرتا ہے خوبصورت چیز کے ٹوٹنے کا دل پر بڑا غمگین اثر پڑتا ہے۔ جنگ و جدل کو
صاف صاف منع کرکے شعلۂ پیکار کو بھڑکانا اور نفسیاتی پہلو سے ضد پیدا کرنے کے اقدام سے
بچاکر بڑی منت سے یہ آرزو ظاہر کردی کہ زور کرتا ہے کرلو مگر خیال رہے کہ اتحادِ باہمی کی کڑیاں
جو خوشنما ہیں وہ ٹوٹنے نہ پائیں۔ غزل میں واقعہ نگاری اور واقعہ نگاری میں تغزل کی
تصویر کشی دیکھئے اسی طرح ہوتی ہے۔

یہ تو ایک مثال ہے۔ وعدہ کرکے پلٹ جانے اور وعدہ خلافی کی واقعہ نگاری
کے لیے قومی نظم میں جو مولانا صفی نے فیض آباد میں پڑھی تھی کیسی عمدہ اچھوتی اور نئی
تشبیہ کا اضافہ فرمایا ہے۔ وہیں گھاگرا سامنے موجزن وعدہ خلافوں کی ٹولی بھی ہے
نام نہیں لیتے کہتے ہیں تو یوں کہتے ہیں ؏

وعدہ کرکے یوں پلٹ جاتے ہیں جیسے گھاگرا

سید کلب عباس نے ایک دوسری نئی تشبیہ کی مثال مولانا صفی کی قومی نظم سے

خسرو باغ الٰہ آباد کی تصویرکشی کی یوں پیش کی ہے جہاں کبھی قومی جلسہ کا پنڈال بنا تھا ؎

باغ یہ واقع ہے اسٹیشن سے تھوڑی دُور پر دید کے قابل ہیں اس کے خوشنما دیوار و در
چار دیواری اگر دیکھیں تو آتے ہیں نظر مختلف پتھر کے ٹکڑے وصل یوں باہم دگر

جس طرح دلق گدائے نازکِ دنیائے زشت
اپنے گھوپے میں چھپائے سازوسامانِ بہشت

بیت کے مصرعہ اول کا شکوہ اور دوسرے مصرع میں گھوپے کا مشبہ اس شکوہ کو باقی رکھتے ہوئے کھپا دینا صفی کا حق تھا۔ دوسرا بند سُنیے فرماتے ہیں ؎

صدر دروازہ دکن کے سمت ہے اس باغ کا آہنی نعلوں کے زیور سے مرصع جا بجا
یہ عوام الناس کی رسموں سے چلتا ہے پتہ ہے یہاں مدفون خسرو کا سمند بادپا

پا گیا ہے رفتہ رفتہ دیکھئے اوجِ کمال
منتوں کا ماننے والا ہے گردوں پر ہلال

آہنی نعلوں کا ذکر واقعہ نگاری ہے مگر سمند بادپا کے ساتھ ان کو گردوں کا ہلال بنا دینا صفی کے بادشاہ تشبیہات ہونے کی دلیل ہے۔ منظر نگاری اور تشبیہات پر تشبیہات کے استعمال کو دیکھئے ؎

سبز پتوں کے گھنے پتوں سے پھاٹک سبز پوش جس طرح آنچل عروسانِ جہاں کا زیب دوش
کیاریاں پھولوں کی کثرت سے دکانِ گل فروش رنگ بن کر پھوٹ نکلا ناسیہ کے دل کا جوش

اہلِ دل کے حوصلے کی طرح اتنا بڑھ گئیں
دیکھتے ہی دیکھتے پھاٹک پہ بیلیں چڑھ گئیں

مسائل زندگی یا تجویزات کے متعلق اقتباسات، دو مطبوعہ قومی نظموں کے ضخیم مجموعے "صحیفۃ القوم" اور "لختِ جگر" ملاحظہ کے قابل ہیں۔ یہ چند مثالیں قومی نظم میں بہاریہ تغزل کے رنگ کی قادر الکلامی دکھانے کے لیے پیش کر دی گئیں۔

غزلیہ شاعری

یوں تو غزل کی تعریف کے بارے میں مشہور ہے کہ خواتین سے بات چیت کرنے کا نام غزل ہے۔ شاعری اور غزل پر بہت سی کتابیں نکل چکی ہیں اس پر کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے غزل اب رفتہ رفتہ ایک ایسا سانچہ بنا لیا گیا ہے کہ اس میں اخلاقی، سیاسی، فلسفیانہ اور دنیا بھر کی باتوں کو بھرتے چلے جاتے ہیں۔ آج کل جودت پسند طبیعتوں کا مطالبہ ہے کہ غزل میں تصوف، مسئلہ سائنس و فلسفہ جملہ مسائل موجود ہوں۔ صفی نے غزل میں جس قدر گنجائش دیکھی اس مطالبہ کو پورا کیا ہے جس کی چند مثالیں یہ ہیں :۔

تصوّف

اپنے حجاب حُسن پہ تم کو بہت ہے ناز
نادیدہ لیکن اہلِ نظر دیکھتے رہے

دولتکدۂ عشق ہے ہر دل کا خزانہ
کب گنج سے خالی کوئی ویرانہ ہے اُس کا

سیاسی مسائل

اس انقلاب کی بھی کوئی حد ہے دیکھئے
ناآشنا سمجھتے ہیں اب آشنا مجھے

فلسفہ اصداقت

زیرِ زمیں انھیں بھی رہنا ہے تا قیامت
جن کے دماغِ نخوت آج آسمان پر ہیں

مسئلہ جذب و کشش

ہے اک بجلی کی رَو ہر دھار خونِ گرم بسمل کی
کہ شہ رگ سے نکل کر جذب ہو جاتی ہے خنجر میں

اخلاقی نصائح

ایسے محل پہ دوستو رخنہ گری ہے خودکشی
ہم بھی اسی جہاز میں تم بھی اسی جہاز میں

غزل میں کیا ہو کیا نہ ہو اس کے بارے میں رایوں کا اختلاف ہے۔ جناب سہیل نے

حدیث حسن کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "کاش حکمت و عرفان کے اثرات اور فلسفۂ نفسیات کے لطیف نکات جو نشاط روح اور سرود زندگی میں بکھرے ہوئے ہیں بجائے غزل کے کسی دوسری صنف نظم میں ادا کئے جاتے ۔ وہ افکار عالیہ جس کا اظہار فانیؔ و اصغرؔ کرتے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں ان کی رسوائی اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ پیرایہ اظہار صنف غزل کو قرار دیا جائے"۔

جناب سہیلؔ کی رائے سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ غزل کا پیمانہ مقرر ہے ۔ اسی غزل کے ساغر میں شراب بھی اُنڈیل دی جائے اور اسی میں آب زمزم بھی ۔ اس کو وہ مناسب نہیں قرار دیتے ۔ مغربی شاعری میں غزل کی طرح کی مخصوص صنف نہیں ۔ جس گھر میں افلاس کا یہ عالم ہو کہ ایک ہی پیالہ ہو وہاں مجبوری ہے ۔ صفیؔ نے اور مسائل کو عہد حاضر کے تمام شاعروں سے کہیں زیادہ اور صنف نظم میں ادا کیا ہے ۔

اب آئیے مولانا صفیؔ کی غزلیہ شاعری پر نظر کی جائے تو ان کی غزلیہ شاعری کا دَور ۱۸۷۰ء کے اور پہلے سے شروع ہوتا ہے جب غزل کے سانچے کے لیے صرف محدود اور اور ایک قسم کی تخئیل تھی پھر دَور بدل گیا اور بمقتضائے زمانہ و معاشرت صفیؔ کو غزل کے سانچے میں جیسے تخیل کو جگہ دینا پڑی اور لفظ اور ترکیبوں کے انتخاب میں جو کد و کاوش کرنی پڑی اور زمانہ کی موافقت کرتے ہوئے ایک نئے شاہراہ اصلاحی کی طرف عوام اہل ذوق کو لانے میں ان کو جو کامیابی ہوئی اس کا نمونہ اسی مجموعہ میں ہے ۔

میرؔ اور صفیؔ

غزل کے لیے اُردو ادب میں سب سے بہتر کسوٹی میر تقی میرؔ کا رنگ تغزل ہے یہ تو کہا نہیں جاتا کہ صفیؔ کی ہر غزل اور تمام شعروں میں میر تقی میرؔ کے رنگ کی جھلک ہے مگر جا بجا صفیؔ کی غزل میں میرؔ کا رنگ ضرور ہے اور میرؔ کے تغزل کے دلدادہ اور اصول کے

جاننے اور برتنے والے بھی صفی تھے اور وہ غالب وناسخ کی طرح محض زبانی میر کے سراہنے والے ہی نہ تھے۔

جن دو خاص چیزوں نے میر تقی میر کو غزل کا استاد منواد یا اس سے علاوہ اور خصوصیات کے میر کے کلام کی صفائی ہے دوسرے اثر صفی شاعری کی صبح ازل سے تھے اور برابر زندگی بھر انھیں دو باتوں کے خود بھی عامل تھے اور صفائی اور اثر ان کا شعار تھا۔ صفی خود بھی میر و آتش اور انیس کے لطف کلام اور صفائی و اثر کے پوجاری تھے اور اس کے ثبوت کے لیے دو دستاویزیں ان کے یہ دو شعر ہیں :-

بہ ثبوت صفائی

صفی کم فرصتی میں جب غزل کی فکر کرتے ہیں
فقط شعروں میں بندش کی صفائی دیکھ لیتے ہیں

ہیں الفاظ آئینۂ حسنِ معنی — صفی کیا صفائی ہے تیرے سخن میں

بہ ثبوت اثر

دل پر صفی اثر ہو جس کا وہی سخن ہے
تعریف شعر یہ ہے خود منہ سے واہ نکلے

میر انیس غزل گو نہ تھے مگر ان کی زبان و کمالات اور اپنی دل پسندی کا ذکر صفی نے "یوم انیس" والی نظم میں کیا ہے۔ آتش کے بارے میں تو صاف صاف صفی یہ کہہ گئے ہیں ؎

ذکرِ زبان آتشِ مرحوم کیا صفی — اک شمع تھی کہ نور کے سانچے میں ڈھل گئی

صفی کو رنگ میر بہت مرغوب تھا اور میر کی صفائی اور اثر کا اتنا ان پر اثر تھا کہ معمولی سے معمولی مضمون اور لطافت لئے جو شعر صفی کے دل سے باہر نکلتا تھا وہ صفائی اور اثر کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ صفی نے اپنے دل کی بات یوں کہہ دی ہے ؎

وہی مرغوب طبیعت ہے صفی کیا کیجے — حسن الفاظ جو معنی کدۂ میر میں ہے

اس سے اور بڑھ کر ایک بات سُنئے کہ صفی کو رنگ میر کی پابندی پر اتنا ناز تھا اور ان کی بلند ہمتی کا یہ عالم تھا کہ کس مزے اور صفائی و اثر میں ڈوب کر یہ کہا ہے ؎

جب کہ معنی کدۂ عالمِ ارواح میں تھے   کرتے تھے مشقِ سخن ہم بھی صفیؔ میرؔ کے ساتھ

صفیؔ کے اس دیوان میں بہت سے شعر میرؔ کے خالص رنگ کے ملیں گے جس پر دھوکا ہوتا ہے کہ کہیں میرؔ کے تو نہیں ہیں۔ ہم اسی غزل کے چند شعر جو سید صدرالاسلام صاحب نے سنائے تھے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں جو غالباً دیوان صفیؔ کی دوسری جلد میں ہوں گے ؎

کی ہے اک عمر بسر زلفِ گرہ گیر کے ساتھ   حشر یارب دلِ وحشی کا ہو زنجیر کے ساتھ

چوٹ کھائے ہوئے دل کو نہ خدارا چھیڑو   آنسو آنکھوں میں بھرے آتے ہیں تقریر کے ساتھ

سوچئے گا جو زمانہ کبھی کچھ فرصت دے   کیا کیا آپ نے اک عاشقِ دلگیر کے ساتھ

جب کہ معنی کدۂ عالمِ ارواح میں تھے   کرتے تھے مشقِ سخن ہم بھی صفیؔ میرؔ کے ساتھ

کل خدا جانے کہ بیمار کی حالت کیا تھی   شب کو اس گھر سے جو نکلا وہ پریشاں نکلا

وہ میری بیکسی وہ وادیِ غربت کا سناٹا   نہ آتا کچھ نظر ہر چند کوسوں تک نظر جاتا

جوانی یاد کر کے آنکھ میں آنسو بھر آتے ہیں   طلوعِ صبحِ پیری ہے ستارے جھلملاتے ہیں

جانا جانا جلدی کیا ہے، ان باتوں کو جانے دو
ٹھہرو ٹھہرو دل تو ٹھہرے مجکو ہوش میں آنے دو

دورِ بہارِ حسن تو ہو پھر جوشِ جنوں کا قحط نہیں
کوکے گی باغوں میں کوئل بور آموں میں آنے دو

بادل گرجا بجلی چمکی روئی شبنم پھول ہنسے
مرغِ سحر کو ہجر کی شب کے افسانے دہرانے دو

صفیؔ کی غزلیہ شاعری پر سید کلب عباس صاحب کے مضمون کے اقتباس ذیل سے روشنی یوں پڑتی ہے :۔

"مولانا صفیؔ کو محض ایک قومی شاعر کہنا صحیح نہیں۔ مولانا کی شاعری کا جزو اعظم

وہ فلسفۂ حیات تھا جو مشرق کا سرمایۂ ناز ہے یعنی دنیا کا دار العمل ہونا اور عقبیٰ کا دار الحساب ہونا۔ مولانا کی مثنوی "تنظیم الحیات" اور اکثر غزل میں یہ فلسفہ نمایاں ہے فرماتے ہیں ؎

جان کیوں لذتِ فانی پہ دیئے دیتے ہو　　زہر آلود مصائب یہ شکر ہے کہ نہیں
مطمئن آج ہو بیٹھے ہوئے جس دنیا میں　　یہ سرا ہے کہ نہیں راہ گزر ہے کہ نہیں
اس خرابات میں اے مستِ غرورِ دولت　　ہر جگہ سر بفلک فتنہ و شر ہے کہ نہیں

نظر جادو اثر کے بیان کرنے میں مولانا کی یکتائی ملاحظہ ہو۔ سیکڑوں شعر سُنے مگر ذیل کے شعر میں جو مزا ملتا ہے کسی دوسرے شعر میں نہیں ملتا ؎

جام ہی کے ساتھ گردش میں مقدر آگیا　　آنکھ ساقی سے ملائی تھی کہ چکر آگیا

مولانا صفی نے چشم انتظار کی صورت کشی کیا خوب کی ہے ؎

پھری ہیں یوں پتلیاں شبِ غم کہ شام ہی سے سحر ہوئی ہے
مگر نہ آنا تھا وہ نہ آئے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہوئی ہے

مولانا کے رنگ تغزل کے خصوصیات کا اظہار اس مختصر مقالہ میں ناممکن ہے۔ مولانا نے لکھنؤ کی پُرانی شاعری میں کچھ ایسی غیر شعوری اصلاحیں فرمائیں کہ یہاں کے رنگین انداز غزل گوئی نے فلسفۂ حیات و احساسات کو اپنے دامن میں بھر لیا۔ اس طرح مولانا کی شاعری کو جدید اور قدیم شاعری کا سنگم کہنا چاہیئے۔ ۱۹۱۵ء کے طوفان خیز بارش کا ذکر مولانا نے اپنی نظم "لخت جگر" میں جس واقعہ نگاری کے ساتھ تغزل کے رنگ میں کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصائب کے سمندر میں طوفان خیز لہریں پیدا ہو رہی ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کی شاعری کی بڑی دھوم ہے کہ مختلف عنوانات اور واقعات زندگی کو نظم کر گئے ہیں اسی طرح میر انیس نے جس کمال کے ساتھ مسدس اور مرثیہ کے ذریعہ سے مختلف حالات رزم و بزم کو پیش کیا ہے وہ غزل کی صنف نہیں ہے۔ صفی نے اس

راہ میں جو خدمت ادب کی فرمائی ہے وہ اور اور صنف میں ہیں۔ صفی کی یہ جدت اور حسن خدمت قابل داد ہے کہ انھوں نے تغزل کا رنگ اور اور صنف نظم کے سانچوں میں بھرا ہے نہ کہ غزل کے سانچے میں زیادہ تصوف اور دیگر مسائل کو بھرنے کی سعی کی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے مولانا اختر علی صاحب تلہری کے ذیل کے مضمون کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

صفی کی غزلیہ شاعری کا تعارف

از علامہ سید اختر علی صاحب تلہری) "مولانا صفی کی شاعری کے پروان چڑھنے کا وہ زمانہ تھا جب لکھنوی شعر و سخن کے چہرے پر زبان اور زبان کے پر تکلف لوازم رعایت لفظی وغیرہ کا غازہ اچھی طرح اپنا رنگ جما چکا تھا۔ زمانہ سابق کے دوسرے لکھنوی شاعروں کی شاعری کے نمونے یہ ہیں:۔

نوک مژہ پہ اشک صباحت نظام ہے	سوٹے پہ آبنوس کے چاندی کی شام ہے
چشم میں سرمے کا دنبالہ بنا کر بولے	کیوں عصا ٹیک کے ہو جائے کھڑی میری آنکھ
باغ کو جاتے ہو پہنے ہو گلابی ٹوپی	بلبل بے ادب آ بیٹھے نہ اے جاں سر پر

ایسے غیر فطری مضحکہ خیز اشعار پر کبھی لکھنؤ کے اہل ذوق سر دُھنتے رہے ہوں گے لیکن صفی اور صفی کے زمانہ شناس خوش مذاق رفیقوں نے اس رنگ سخن کو دیکھتے دیکھتے داستان ماضی بنا دیا۔ صفی کا کمال یہ ہے کہ ایسے خلاف قیاس تشبیہوں اور دور از کار استعاروں کی آمد کو روکا۔ ان کی نظموں سے ثبوت ملتا ہے کہ زبان اُردو میں نئے نئے استعاروں اور تشبیہوں کی جگہ نکالی اور اس طرح کے نغمے غزل کے شاعری میں بھرے ؎

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا	ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

اللہ اللہ تیرے خاکستر نشینوں کا دماغ یہ بھی کچھ پروا نہیں کب فرش دیبا جل گیا
کہہ رہا ہے دہقاں سے دانہ دانہ خرمن کا خونِ دل کے قطروں سے نرخ ہے گراں اپنا
دست بُردِ گلچیں سے خار و خس میں شامل ہے شاخِ گل کی زینت تھا ورنہ آشیاں اپنا
اسی طرح ابھی اے انقلاب آئے جا رہے سہے جو نشاں ہیں اُنھیں مٹائے جا
کسی کا قصۂ غم قصہ خواں سنائے جا کہ سو چلا ہے زمانہ اسے جگائے جا
ستم گری کی کوئی حد ہے آسماں آخر زمیں پہ خون کے دریا نہ یوں بہائے جا
بے لوث محبت ہے جسے ملک سے اپنے وہ برہنہ پا خسروِ بے تاج و نگیں ہے

کل ہم آئینے میں رُخ کی جھریاں دیکھا کئے
کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے
زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اُجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے

غزلیہ شاعری کے جب یہ دونوں رنگ آمنے سامنے رکھے جاتے ہیں تو اس کا اعتراف ناگزیر ہو جاتا ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کو صحیح جادے پر ڈالنے میں صفیؔ مرحوم کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ انھوں نے اس کی چمن پیرائی و چمن آرائی بڑے سلیقہ سے کی ہے۔ بہت سا خس و خاشاک وہاں سے ہٹایا ہے۔ بہت سے اُگ آنے والے پودوں کی کاٹ چھانٹ کی ہے اور بہت سے نئے خوش رنگ پھلتے ہوئے پودے اُس میں جمائے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُن کی غزلوں میں نہ غالبؔ کی فلسفیانہ گہرائیاں ہیں اور نہ زیادہ تر شعر میں میرؔ کی جذبات آشوب سرمستیاں اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ کبھی کبھی مقامی رجحان کے دباؤ سے ایسے شعر بھی کہہ دیتے ہیں ؎

مری نعش کے سرہانے وہ کھڑے یہ کہہ رہے ہیں
اسے نیند یوں نہ آتی اگر انتظار ہوتا

یارب پڑی رہے مری میت اسی طرح بیٹھے رہیں وہ بال پریشاں کیے ہوئے

تاہم عمومی حیثیت سے اُن کے اشعارِ غزل میں جذبات کا نشاط خیز ٹھہراؤ پایا جاتا ہے۔ عشق و محبت کے متعلق اُن کا اندازِ نظر پاکیزہ ہے بوالہوسانہ نہیں ہے۔ وہ معمولی سے معمولی خیال میں حیرت خیز پہلو پیدا کر لیتے ہیں۔

دنیا کی نمود سیمیائی نمود ہے۔ اس کے موجودات دامِ خیال کے حلقے ہیں۔ یہ سب باتیں حکیمانہ وزن رکھتی ہیں لیکن اس مفہوم کو تشبیہی پیرایہ میں یوں ادا کرنا ؎

دنیا کا ورق بینشِ اربابِ نظر میں اک تاش کا پتہ ہے کفِ شعبدہ گر میں

کم ندرت خیز نہیں ہے۔ دنیا کے ورق کو کفِ شعبدہ گر میں تاش کا پتہ قرار دینا کسی معمولی صنعت گر کا کام نہیں ہے۔

صفیؔ کی یہ وہ لطیف اور رواں صنعت گری ہے جو اُنھیں کبھی کل کا شاعر نہیں بننے دے گی۔

یہ سچ ہے کہ اب غزلیہ شاعری کا کارواں ان منزلوں سے بھی کہیں آگے نکل چکا ہے۔ تخئیل کے انداز بدل گئے ہیں۔ بیان کے اسلوب بدل گئے ہیں۔ غزلیہ اشعار کے نکھار کے رُخ اور ہو گئے ہیں۔ اُن کے رچاؤ کا رنگ دوسرا ہو گیا ہے اس لیے ممکن ہے صفیؔ کی غزلیہ شاعری کے بعض حصّوں میں آج کل کے اربابِ ذوق کو حُسنِ برافگندہ نقاب کے وہ جلوے نظر نہ آئیں جن کی تلاش اُن کی آنکھوں کو رہتی ہے لیکن اس سے اُن کی غزلوں کا پورا سرمایہ تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آج کل کے ذوق کے لحاظ سے بھی اس اندھیرے میں بہت سے جگنو چمکتے نظر آئیں گے اور اس طرح اُن کے غزل کی ضو کبھی ماند نہیں پڑے گی۔

شاید خیال کیا جائے کہ صفیؔ کی اُردو شاعری کی خدمت گذاری اُردو غزل کے گیسوئے مشکیں سنوارنے ہی تک محدود رہی تو ایسا نہیں ہے۔ اُردو شعر و ادب کی

خدمت کے سلسلے میں اُنھوں نے اس سے زیادہ ٹھوس اور شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ صفیؔ نے حالیؔ کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ حالیؔ کی طرح صفیؔ کے قلب و دماغ میں زندگی کے مسائل کے متعلق بہت سے خیالات کروٹیں لے رہے تھے اس لیے ان کے شعری ذوق کی بھی تسلی بالآخر غزل سے نہ ہوسکی اور انھیں اپنے ان خیالات کے اظہار کے لئے شاعری کی دوسری صنفوں سے کام لینا پڑا۔ انھوں نے اس کے لئے مسدس چُنا۔ مثنوی چُنی اور ان پُرانے ساغروں میں اپنے اصلاحی خیالات کی نئی شراب پیش کی..... صفیؔ کی بلند مقامی کے نشان یہاں زیادہ مکمل طور سے واضح ہوتے ہیں۔ (اختر علی تلہری)

صفیؔ اور اصلاحِ تخئیل

مولانا صفیؔ نے سب سے پہلے اصلاحِ تخئیل کے لئے اپنے مکان پر قریب ۱۸۹۵ء کے ایک انجمن دائرہ ادبیہ قائم کی۔ اس میں خاص خاص موضوع پر انگریزی نظموں کی طرح کی نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ فرسودہ اور قابل اعتراض تخئیل میں اصلاح کی صورتوں پر غور ہوتا تھا اور نظم اور غزل میں نئے خیالات و تخیّل کو جگہ دی جاتی تھی منشی سجاد حسین صاحب اڈیٹر "اودھ پنچ" اور ڈاکٹر مرزا محمد ہادی صاحب ان کے رفیق اور شریک کار تھے۔ اس کا ذکر ظریفؔ کے دیوان کے مقدمہ میں موجود ہے۔

صفیؔ کی غزلیہ شاعری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پُرانے حدود اور اصولِ فن میں جدید رنگ کے سمو دینے میں غیر معمولی خدمت انجام دی۔ صفیؔ کے جادے اور نکالے ہوئے راستے پر بعد کو چلنے والے آگے نکلتے چلے گئے مگر وہ فضیلت جو موجد کے حصے کی بات ہوتی ہے اس کا سہرا صفیؔ کے سر ہے۔ مولانا حسرتؔ موہانی نے اس بارے میں وہ نام پیدا کیا کہ اصلاحی رنگ کے موجد ہونے کا ان پر دھوکا ہونے لگا اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لئے اُردوئے معلٰی سے مولانا حسرتؔ کی تحریر بجنسہٖ نقل کی جاتی ہے۔

[از مولانا حسرت موہانی] "نصیر الدین حیدر اور غازی الدین حیدر شاہان اودھ کے زمانے میں غزل اور اس کی تخئیل کا جو اندازہ تھا وہ اُردو اہلِ ادب دقیقہ شناس نظروں کے سامنے ہے۔ اس کی تاسی اور پیروی میں کیا بلحاظ لفظ و بندش اور کیا بلحاظ تخئیل جس طرح شعرائے لکھنؤ منہمک تھے اس میں ترمیم و اصلاح کی ہمت کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ مولانا صفی کی زندگی اور شاعری کا ایک کارنامہ ہے۔"

مولانا حسرت کے ان خیالات کی اور صیقل شدہ اور ترقی پذیر وضاحت سید احتشام حسین صاحب کے مضمون سے ہوتی ہے جو بجنسہ پیش ہے۔

صفی اور جدید شاعری

[از سید احتشام حسین صاحب ایم، اے لکھنؤ یونیورسٹی] سید علی نقی صفی مرحوم کی شاعری کے متعلق کچھ لکھتے ہوئے ایک خاص قسم کی دشواری کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کے کلام کی مقدار بہت زیادہ ہے لیکن نظروں کے سامنے بہت کم ہے۔ جو کچھ طبع ہو چکا ہے اُس میں سے بھی کئی مجموعے نایاب ہیں، اس لئے تاریخ ادب میں اُن کے مقام کا تعین تو اُسی وقت ہو سکے گا جب کلام کا زیادہ حصّہ نظروں کے سامنے آئے گا، تاہم اُن کی شاعری کے مختلف رجحانات کی طرف یا کسی خاص پہلو کی جانب مختصر اشارے کئے جا سکتے ہیں، ان میں صفی کے کلام کی گوناگونی، تنوع، فنی خصوصیات، زبان و بیان کے حسن کے متعلق بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ محض یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ صفی کی نگاہ زندگی کے اُن مسائل تک بھی جاتی تھی جن کی طرف دَورِ جدید کے شعراء نے خاص طور سے توجہ کی اور اس طرح انھیں لکھنؤ کی شاعری کے محض ایک رسمی ترجمان کی حیثیت سے دیکھنا غلط ہوگا۔

صفی مرحوم کی شاعری پر غور کرتے ہوئے جن باتوں کو ذہن میں رکھنا چاہیئے اُن میں سے خاص خاص یہ ہیں۔ جب صفی کے یہاں شاعرانہ شعور پیدا ہوا اُس وقت لکھنؤ کی

ادبی فضا کیا تھی، صفیؔ اُس سے کس حد تک متاثر ہوئے اور کس حد تک اُنھوں نے نئی روایات قائم کیں؟ اُس وقت لکھنؤ کے باہر دوسرے ادبی مرکزوں میں شعر و سخن کے متعلق کیا خیالات تھے، اِن خیالات کے سوتے کہاں سے پھوٹتے تھے؟ اگر انیسویں صدی کا آخری زمانہ تغیّرات کا زمانہ تھا تو ان تغیّرات کی نوعیت کیا تھی؟ انھیں باتوں پر غور کرکے ہم اسیرؔ، امیرؔ اور جلالؔ کو حالیؔ اور آزادؔ سے الگ کرسکتے ہیں، لکھنؤ کے نئے جذباتی رنگ میں میرؔ اور غالبؔ کے اثرات کا پتہ لگا سکتے ہیں، معیارِ ادب کے گرد جمع ہونے والے شاعروں میں فرسودگی کے خلاف ایک محدود قسم کی بغاوت کا جذبہ دیکھ سکتے ہیں اور اُس وسعتِ نگاہ کا مطالعہ کرسکتے ہیں جس نے صفیؔ کی شاعری کو جنم دیا۔ میرا خیال ہے کہ شعوری طور پر صفیؔ ہی پہلے لکھنوی شاعر ہیں جنھوں نے جدید ادبی تحریکات کو صرف سمجھا ہی نہیں بلکہ اُن کا خیر مقدم بھی کیا۔ اُن کی نظموں میں جا بجا حالیؔ اور آزادؔ کے کارناموں کا ذکر ملتا ہے اگرچہ لکھنؤ کا ایک بڑا حلقہ اودھ پنچ میں شعر و شاعری کے نئے تصوّرات کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ صفیؔ اُس محدود جاگیردارانہ اور قدامت پسندانہ ماحول سے باہر نکلنے کی برابر کوشش کرتے رہے جس نے بدلتے ہوئے حالات میں ادبی ترقی کی راہیں روک رکھی تھیں۔ گویا ایک سستی اور بے جان لفظ پرستی کی دنیا میں ایک معنوی انقلاب کے نقش اُبھر رہے تھے۔ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صفیؔ نے تمام قدیم ادبی روایات سے انحراف کیا تھا یا تجدّد کے سبھی پہلوؤں کو قبول کر لیا تھا بلکہ یہ کہ انھوں نے شاعری کو قومی زندگی کے مطالبات سے قریب لانے کے سلسلہ میں بہت سی نئی شمعیں روشن کی تھیں اور شاعری کے ذریعہ واضح طور پر اُن اخلاقی قدروں کی ترجمانی کی تھی جن سے قومی تعمیر میں مدد ملتی ہے۔ ہم اس نئے رجحان کو کوئی انقلابی رجحان نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ ایک قسم کا رومانی انقلاب تھا جو زیادہ تر صفیؔ تک محدود رہا۔ اس میں فکری رنگ کے مقابلہ میں جذباتی رنگ گہرا ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جب حالات بدلنے کے تاریخی اسباب پیدا ہوتے ہیں تو اچھے شاعر اور ادیب اس تبدیلی میں معاون ہوتے ہیں اور خود بھی بدل جاتے ہیں۔ یہی عمل ارتقا انفرادی اور جماعتی زندگی میں رابطہ قائم کرتا ہے۔ صفیؔ کی نظموں کے مطالعہ سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ شیعوں میں بیداری کی جو لہر اُٹھ رہی تھی، ملک میں آزادی کے جو جذبات اُبھر رہے تھے، تعلیمی اور معاشرتی اِصلاح اور ترقی کے جو امکانات پیدا ہو رہے تھے، صفیؔ نے اُن کا ساتھ دے کر خود اپنے شعور کی حدیں وسیع کر دیں۔

اِن چند بے ربط سطروں میں تغیر پیدا کرنے والے حقائق کی طرف محض اشارے کئے جا سکتے ہیں، ان سے صفیؔ کی شاعری میں جو نیا پن پیدا ہوا، قدیم اور جدید کی جو آمیزش ہوئی، مقصدی ادب کے جو پہلو پیدا ہوئے، اُن کی تفصیل نہیں بیان کی جا سکتی۔ پھر غزلوں کے اس دیوان کو متعارف کراتے ہوئے تو اس کا محل بالکل ہی نہیں ہے۔ پھر بھی ان باتوں کا عرض کرنا اس لئے ضروری تھا کہ گو غزل کی شاعری نئے اثرات کو آسانی سے قبول نہیں کرتی لیکن ایک شاعر کے لئے یہ بالکل ناممکن بھی ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی شاعری کے یا دوسرے لفظوں میں اپنے شعور کے کسی خاص حصے کو اُن باتوں سے متاثر نہ ہونے دے جس سے اُس کے شعور کے اور حصے متاثر ہوتے ہیں۔ اندازِ بیان کی مجبوریاں، روایت کی پابندیاں راہ میں ضرور حائل ہوتی ہیں تاہم یکسر علیحدگی ناممکن ہے۔ صفیؔ کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گو انھوں نے محض الفاظ اور محاورات، اندازِ بیان اور طرزِ ادا کے حُسن میں اسیر رہنا پسند نہ کیا پھر بھی وہ غزلوں میں پوری طرح اُس "نئے پن" کو نہ برت سکے جیسے نظموں میں برتا تھا۔ وہ جذباتی رنگ جس کی جھلک امیرؔ اور جلالؔ کے یہاں ملتی ہے اُس نے لکھنؤ کے شعراء کو بہت متاثر کیا تھا اور کم و بیش سبھی اہم شعراء اپنے اندازِ نظر کے مطابق رقت پسندی اور جذباتیت کے رنگ میں ڈوب گئے تھے۔ صفیؔ کے یہاں بھی اس کی نمود ہے۔ اُن کی داخلیت میں شدت نہیں ہے، اس لئے اُن کی جذباتیت بھی بعض دوسرے شعراء سے مختلف ہے۔

صفیؔ کی زندگی اور شاعری کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص رنگ کا اخلاقی تصوّر اور انسانی درد بھی رکھتے تھے۔ اِس کی نمود واضح شکل میں تو نظموں ہی میں ہوتی ہے لیکن غزلیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ زندگی کے اہم مسائل بھی بڑی سادگی سے جگہ پا جاتے ہیں جن سے اُن کی فکر پسند طبیعت کا پتہ ملتا ہے۔ صفیؔ کے یہاں لطفِ زبان اور لطفِ بیان کے امتزاج سے پُرانے اور رسمی خیالات میں بھی تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔

چند اشعار سے اِن خصوصیات پر روشنی پڑ سکتی ہے ؎

قفس پھر کیا بُرا ہے آشیاں ہوتا تو کیا ہوتا
نہیں جب طاقتِ پرواز ہی دلِ خستہ بلبل میں

کہہ دو لگائے تیر مِرا دل ٹھہر گیا
ناحق نشانہ باندھ کے قاتل ٹھہر گیا

دَم رکا ہوا دیکھا، دل بُجھا ہوا پایا
شامِ ہجر آتے ہی کیا ہوا خدا جانے

اور بالفرض وہ ظالم جو پشیماں نہ ہوا
ہو ستم سے کوئی نادم تو شکایت بھی سہی

ہو موافق جو گلستاں کی ہُوا میرے بعد
ہمصفیرانِ چمن یاد مجھے کر لینا

اک فتنہ گر کو بے سبب آزار دیکھ کر
لو چرخ نے بھی کھینچ لیا اب ستم سے ہاتھ

تسبیح سے کشاکشِ زنّار دیکھ کر
ڈر ہے مجھے کہ رشتۂ اُلفت نہ ٹوٹ جائے

اب راستہ خضر سے کوئی پوچھتا نہیں
روشن کئے وہ نقشِ قدم نے ترے چراغ

اِن اشعار پر غور کرنے والے کے دل میں یہ خواہش ضرور پیدا ہو گی کہ وہ صفیؔ اور اُن کے کلام سے شناسائی حاصل کرے، ان سے لطف اندوز ہو اور ان کی تاریخی اہمیت کا اندازہ لگائے کیونکہ صفیؔ ابھی کچھ دن پہلے تک لکھنؤ میں محض ایک شاعر کی حیثیت سے زندہ نہیں تھے بلکہ ایک ادبی ادارہ تھے جس سے شعر و سخن کی دنیا میں اچھی خاصی چہل پہل تھی

مرتب] غزلیہ شاعری اور صفیؔ کی غزل گوئی کے صنعت گری پر کم و بیش کچھ اظہارِ خیال چند ادیب کر چکے۔ اس سلسلہ میں ایک خاص بات کی طرف شاید کسی کو فکر و توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا جس پر شہنشاہ حسین صاحب رضوی علیگ۔ ایم، اے سابق اڈیٹر "خیاباں" نے بڑی جدت طرازی سے

اظہار خیال فرمایا ہے اور وہ خاص بات جو صفی کے آرٹ میں انھوں نے چھانٹ کر دکھائی
ہے وہ ان کے مطلع نگاری کا کمال ہے جو اور شاعروں سے ان کو خصوصیت سے ممیز کرتا ہے۔
ان کے ذیل کے مضمون میں ایک بات جو ذکر کرنے سے رہ گئی تھی وہ یہ ہے کہ کون سی واقعی
بات اور کیا خاص مشق تھی جو اچھا مطلع صفی سے کہلا دیتی تھی۔ جن لوگوں کو غزل اور غزل میں
مطلع کہنے کا ملکہ ہے ان کو مطلع کے نظم کی دشواریوں کا خوب اندازہ ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ
قافیہ کے ساتھ ردیف کا جو گہرا تعلق ہے اس کا تال میل درست کرنے اور بھرتی کے
الفاظ سے بچنے اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے مطلع کہنے میں شاعر کو کتنا خون خشک کرنا پڑتا
ہے پھر مطلع میں ایک ہی مصرع کی کم جگہ اور کم لفظوں میں تمام دشواریوں کا حل ڈھونڈھنے
کے ساتھ دوسرے سامنے کے مصرع کے قافیہ اور ردیف کی دقتوں کا حل اور دونوں مصرعوں
میں خیال کے ربط و توازن کو کچھ وہی جانتا ہے جس کو تخئیل کے سنوارنے کا کام سر انجام
دینا پڑتا ہے۔ صفی مطلع کیوں اچھا کہتے اور پورے توازن اور صحیح سانچے میں ان کا مطلع کیوں
پورا اُتر جاتا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتداء ہی سے غزل کی مشق کے ساتھ کئی ہزار شعروں
میں ان کو مسدس قومی و ملکی نظموں میں یہی کام دو مصرعوں میں پورا کرنا پڑا۔ ۱۸۸۵ء میں
"نخل فریاد" کے نام سے جو مثنوی صفی نے مسائل حیات پر کہی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداء
ہی سے مطلع کی مشق کا سامان قدرت نے ان کے لئے ودیعت کر رکھا تھا اور پھر یہ سلسلہ
زندگی بھر لگا رہا۔ کسی قوم، کسی ادارے کا جلسہ ہو، منتظمین صفی کے دروازے پر نظم کہلانے
کے لئے گھر گھیرے بیٹھے ہیں۔ جوالا پرشاد بی، اے۔ برق نے شکسپیر کے نظموں کے صدہا
اشعار کے ترجمے پر اصلاح و درستی کے کام میں صفی سے میرے سامنے مدد لی۔ اس طرح
کی سیکڑوں مثالیں ہیں جن سے مشق مطلع نگاری کے روز نت نئے سامان صفی کے لئے
نکلتے رہے۔ صفی اگر مطلع اچھا نہ کہتے تو تعجب تھا۔ ان کا مطلع نگاری میں منفرد ہونا کوئی
حیرت انگیز بات نہیں۔ صفی کو بہترین مطلع نگار ہونا ہی چاہیئے تھا جیسا کہ واقعی تھے۔

اس حیثیت سے اس مقدمہ کے اس مضمون ذیل پر نظر کرنا بھی دلچسپی اور صداقت کے ساتھ انصاف ہوگا۔

صفیؔ کی مطلع نگاری ——— ایک مطالعہ

(از سید شاہنشاہ حسین صاحب ایم، اے)

شعرا کا تعارف] کون ہے جو صفیؔ سے واقف نہیں صفیؔ نے کوئی ۹۰ برس کی عمر پائی۔ اس کم وبیش ایک صدی کے طویل وقفے میں لکھنؤ کے بزم ادب میں کون کون آیا اور کون کون اُٹھ گیا۔ صفیؔ کی شاعری نے جب آنکھیں کھولی ہوں گی تو میر تقی میرؔ کے لڑکے میر کلّو عرشؔ، میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، میر مونسؔ، تعشقؔ، امیرؔ مینائی اور نواب مظفر الدولہ مظفر علی خاں اسیرؔ کو صفیؔ نے دیکھا ہوگا اور جب صفیؔ کی شاعری کی بھرپور جوانی ہوگی تو برقؔ، بحرؔ، قلقؔ، امیرؔ مینائی، ادبؔ، عشقؔ، انسؔ، نفیسؔ، تعشقؔ، میر بادشاہ علی بقاؔ، علی میاں کاملؔ، ذاکر حسین یاسؔ اور حکیم ضامن علی جلالؔ اور نہ معلوم کون کون موجود ہوں گے۔

یہ غدر کے پچاس برس بعد کی کہانی ہے اور اب اس کے بعد تیسرا دور شروع ہوتا ہے اس میں پیارے صاحب رشیدؔ، دولھا صاحب عروجؔ، سید علی محمد عارفؔ، میاں عشقؔ مرزا اوجؔ، جوالا پرشاد برقؔ، برج نرائن چکبستؔ، محمد ہادی رسواؔ، حکیم دانشؔ، ابرؔ، بلیغؔ، ہاتفؔ، فاخرؔ، قدیمؔ، جاویدؔ، لڈن صاحب بہارؔ، چھنگاؔ، شفیقؔ، آرزوؔ، مرزا ثاقبؔ نمایاں شاعر اور آسمان تغزل کے جگمگاتے ستارے ہیں۔

لکھنؤ کا تغزل] اس وقت کے شعراء کا خاص شغف تغزل تھا اور غزل ہی میں طبع آزمائی کی کہنہ مشقی شاعر کو درجۂ کمال تک پہونچا دیتی تھی۔ غدر سے پہلے اور غدر سے نصف صدی کے کچھ بعد تک لکھنؤ کا تغزل دَورِ ابتذال سے گزر رہا تھا لیکن جتنا زمانہ گزرتا جاتا تھا تغزل بھی ہندوستان کے ذہنی انقلاب کے ساتھ کروٹیں لیتا ہوا اپنا چولہ بدل رہا تھا۔ اس میں پستی تخئیل، صوفیانہ طرزِ ادا، عریانی جذبات کا عنصر رفتہ رفتہ مفقود ہوتا جاتا تھا،

اور اس کی جگہ تخئیل کی بلند پروازی زبان کی لطافت اور ستھرا پن اور جذبات کی صداقت اور پھر سوز و گداز کی ہلکی ہلکی چاشنی پیدا ہوتی جاتی تھی ۔

صفی کا تغزل صفی بھی اس کشمکش میں مبتلا ہو کر اپنے تغزل کے دامن کو لکھنؤ شاعری کے ابتدائی ابتذال سے آلودہ ہونے کے باوجود بے داغ نکلنے کی سرگرم کوشش میں تھے۔ ان کے ابتدائی تغزل میں اگر لکھنؤ کے دیگر معاصر شعرا کے کلام کی ایسی پستیاں ہیں تو ان کے آخری کلام میں اس دورِ انقلاب سے متاثر ہونے کے بعد رفعتیں بھی ہیں۔ ابتدا ہیں ناسخیت کا غلبہ اور قدیم اسکول شاعری کے عام اثرات اگر پوری کامرانی کر رہے ہیں تو عہد جدید کی حیات میں جذبات وطن، قومی بیداری، تخیل، زبان، محاکات، مضامین کی آمد، متانت، سنجیدگی، تہذیب وغیرہ وغیرہ کی رفعتیں بھی ہیں۔ اس اعتبار سے صفی کو اگر ایک انقلابی شاعر اور لکھنؤ کے تغزل کا منفرد نکھارنے والا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا ۔

صفی کی مطلع نگاری ان سطور میں صفی کے تغزل پر تبصرہ راقم الحروف کا مدعا نہیں۔ یہ بڑا کام ہے اور کافی وقت چاہتا ہے ۔ وقت کوتاہ قصہ طولانی ، ایک چیز جو مجھ کو ان کے غزلیات کے مطالعہ کے بعد محسوس ہوئی وہ ان کا کمال مطلع نگاری ہے اور کوشش ہے کہ جو کچھ بھی لکھا جائے وہ ان کے اس کمال کو اہل نظر کی نظروں کے سامنے پیش کرنے تک محدود رکھا جائے ۔

مطلع غزل کی جان ہے ۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ دونوں مصرعوں میں ایک خیال اور وہ بھی دو مختلف قافیوں کی جکڑ بندی سے اس کو غزل کے دیگر ابیات سے دشوار بنا دیتا ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ غزل گو کو اپنی غزل ہیں سامع کی مخاطبت حاصل کرنے کے لئے اپنے تغزل کے آرٹ کی تمام سحر طرازیوں کے دریا کو ایک کوزے میں بند کرنا پڑتا ہے یا یوں سمجھیے کہ جس طرح کسی گھر کا صدر دروازہ جتنا ہی عالی شان اور بلند ہو اتنا اس گھر کی عظمت کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے ۔ یوں ہی

غزل کا مطلع بمنزلہ صدر دروازے کے ہے ۔

اس اعتبار سے صفیؔ کے مطلعے ان کے کمال تغزل کے نمایاں آئینہ دار ہیں اور اسی روشنی میں ہم ان کے چند مطلعوں کا مطالعہ کریں گے ۔

ابتدائی دور

سنہ ۱۸۸۵ء

ضعف میں کرتا ہوں کب قطع مسافت پاؤں سے
نکل جاتی ہے زمین راہِ غربت پاؤں سے

دوسرے مصرع نے ضعف میں قطع مسافت نے کیا خوب لطف پیدا کیا ہے ۔

سنہ ۱۸۸۹ء

راہِ خدا میں نفس حریفانہ ساتھ ہے ہشیار اک ذرا سگِ دیوانہ ساتھ ہے

'ہشیار اک ذرا' نے کیا لطف دیا ہے ۔

سنہ ۱۸۹۰ء

کس قدر اچھا ہے نور اس کا کہ خود مستور ہے
جلوہ گر دل کے قریب آنکھوں سے لیکن دُور ہے

'نور مستور' کی جگہ کا تعین اور پھر اس کا اس قدر قریب ہو کر آنکھوں سے دُور رہنا واہ کیا کہنا !

سنہ ۱۸۹۴ء

وہ اور کچھ نہ سہی لطف انتظار تو ہے کہ غیر کو ترے وعدے کا اعتبار تو ہے

غیر کے اعتبار وعدہ سے انتظار کیا لطیف تغزل ہے

سنہ ۱۸۹۹ء

دہ عالم ہے کہ مُنہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے
شبِ فرقت کے غم جھیلے ہوؤں کا دَم نکلتا ہے

وہاں بالوں میں کنگھی ہو رہی ہے خم نکلتا ہے
یہاں رگ رگ سے کھنچ کھنچ کر ہمارا دم نکلتا ہے

یہ دونوں مطلعے لکھنؤ کے قدیم رنگ شاعری میں ڈوب کر کہے گئے ہیں اور بڑے مزے میں کہے گئے ہیں۔

۱۸۹۹ء

انتظارِ مرگ میں پیری نفس بر دوش ہے
کوئی دم میں اب چراغِ زندگی خاموش ہے

انتظارِ مرگ میں پیری کا نفس بر دوش ہونا اور کوئی "دم میں" چراغِ زندگی کا خاموش ہونا! یہ ایک ایسا شعر ہے جو مصور ہونے کے قابل ہے صفی نے اس مطلع میں اپنے کمال کا آرٹ دکھلا دیا۔

۱۸۹۹ء

جو بڑھے حدِ طریقت سے وہ تھک جائیں گے
کفر و ایماں کے دوراہے پہ بھٹک جائیں گے

سالک حدِ طریقت کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جو آگے بڑھے وہ سالک نہیں۔ حد سے بڑھنا تھکا کر بٹھا دے گا پھر اس کا کفر و ایمان کے دوراہے پر بھٹکنا لازم ہے۔

۱۹۰۰ء

محشر میں جا کے آخر کیا داد خواہ کرتے　　کہتا اسی کی ایسی جس کو گواہ کرتے

بھلا حصولِ تمنا کی جستجو کیا ہے　　جو زندگی میں بر آئے وہ آرزو کیا ہے

آرزو کی کیا خوب تعریف ہے۔ پھر حصول تمنا کی جستجو بے سود۔

سنہ ۱۹۰۶ء

وہ بزم دیکھئے طرب افزا کہیں جسے ڈھاتا ہے دل ہی ساز تمنا کہیں جسے
یہ دل ہو خون شرح تمنا کہیں جسے ٹپکے وہ قطرہ آنکھ سے دریا کہیں جسے

سنہ ۱۹۰۷ء

مر بھی گئے ہم اور نہ ان تک خبر گئی اے آہ واپسیں یہ بتا تو کدھر گئی

سنہ ۱۹۱۲ء

کہاں تک تھی خوشی کے ساتھ وابستگی غم کی
ذرا شیرازہ بندی دیکھئے اجزائے عالم کی

سنہ ۱۹۱۹ء

الٰہی زندگی کیا، موت کیا بیمار ہجراں کی
پریشاں خواب وہ، تعبیر یہ خواب پریشاں کی

سنہ ۱۹۱۹ء

دیکھئے کیوں کوئی تربت ہوگی دیکھ کر اور ندامت ہوگی
باتوں ہی باتوں میں کیا بات پیدا کر دی ہے۔ یہ صفی کا کمال تغزل ہے۔

سنہ ۱۹۳۱ء

جب تک کہ دل میں دل ہے تری آرزو رہے
شل ہوں جو تھک کے پاؤں غم جستجو رہے

گھٹا اٹھی ہے کالی اور کالی ہوتی جاتی ہے
صراحی جو بھری جاتی ہے خالی ہوتی جاتی ہے

۱۹۲۳ء

کیا تم نے وعدہ اور تم شب انتظار آئے
ہمیں اعتبار آئے کہ نہ اعتبار آئے

دیکھئے کیا ہم اسیروں پہ بلا آتی ہے
آج کچھ روزنِ زنداں سے ہوا آتی ہے

ٹپکے کبھی کسی مژۂ تر کے ہو گئے   قطرے مرے لہو کے اسی بحر کے ہو گئے

۱۹۲۵ء

حیلہ گر ساتھ ہیں کچھ باتوں میں اُلجھانے کو
لے چلے ہیں سوئے زنداں ترے دیوانے کو

صلاحیں تھیں یہ دیوانوں کی غافل پاکے درباں کو
چلو زنجیر سے زنداں کی ناپ آئیں بیاباں کو

اس سے دس پانچ برس پہلے یا ۱۹۲۵ء تک صفیؔ کے تغزل کا دَورِ اوّل شمار کیجئے۔ اور اس کے بعد سے دَورِ ثانی کہئے۔ اب ہم ذیل میں چند مطلعے اس دَورِ ثانی کے پیش کرتے ہیں آپ بھی لطف اندوز ہوں۔

۱۹۲۶ء

دَورِ ثانی]

راہ پہ خود آجائے گا آخر ٹھوکریں کچھ دن کھانے دو
دیوانہ ہے دل سے نہ اُلجھو آؤ بھی ہو گا جانے دو

۱۹۳۳ء

دکھائے گا درِ صیاد شاید آسماں مجکو — قفس معلوم ہوتا ہے چمن میں آشیاں مجکو

شیشوں کی طرح ٹوٹے توبہ سرِ میخانہ — ساقی پھر اسی کن سے اک لغزشِ مستانہ
کیا رندِ بلاکش کا سرمایۂ میخانہ — ڈرکا ہوا اک شیشہ رستا ہوا پیمانہ
ہر اک سے اُلجھتا ہے اپنا ہو کہ بیگانہ — پوچھو نہ روش دل کی دیوانہ تو دیوانہ

جا کے جب تازہ مزاروں پہ چراغاں کرنا — ایک ٹوٹی ہوئی تربت پہ بھی احساں کرنا

۱۹۳۸ء

پتا میرا بتادے کاش بڑھ کر آرزو میری — مری ناکامیوں کو دیکھتی ہے جستجو میری

۱۹۴۲ء

سودائے زلیخا کی تصویر نظر آئی — پائے مہِ کنعاں کی زنجیر نظر آئی
فرقت میں مہِ نَو کی تنویر نظر آئی — مجھ خمِ ابرو کو شمشیر نظر آئی

۱۹۴۳ء

دل میں سکت نہ بوند لہو کی جگر میں ہے — نالے کی سادگی کہ فریبِ اثر میں ہے

خدا جانے خبر آئے نہ آئے — پلٹ کر نامہ بر آئے نہ آئے

صفیؔ کی غزل گوئی کا دَور بہت سکون سے گزرا قومی نظموں کے شوق نے ان کو غزل گوئی سے قریب قریب کنارہ کش کر دیا تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ غزل گوئی سے ان کو خود تنفر سا پیدا ہو گیا تھا بلکہ جہاں تک ہماری سمجھ میں آتا ہے اس کا خاص سبب یہ ہے کہ لکھنؤ کے شعر و سخن کا چمن اُجڑ چکا تھا۔ ہمصفیر ایک ایک کر کے ان کی نگاہوں کے

سامنے اُٹھ چکے۔ مشاعروں کی بد مذاقیوں نے اور اہل کمال کی ناقدری نے ان کے دل کو پھیکا کر دیا تھا۔ جہاں تک ان کی غزل گوئی کے عہد کا تعلق ہے سچ پوچھیے تو ان کی زندگی ہی میں ان کی وفات سے بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔

محاکمہ } آخر میں اس امر کا بھی اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ صفی کا کوئی نقاد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ان کے زیر نظر مطلعے نقائص و مسامحات سے بالکل پاک و صاف ہیں۔ ابھی زیادہ دنوں کی بات نہیں۔ حامد علی خاں صاحب بیرسٹر مرحوم کے مشاعرے میں جو مطلع صفی نے پڑھا وہ بہت دنوں تک چہ میگوئیاں پیدا کرتا رہا۔ صفی کا مطلع یہ تھا ؎

یہ دردِ عشق نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا اس دل سے
کہ موت آئے گی آسانی سے دم نکلے گا مشکل سے

اس مطلع کے متعلق ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ صفی کے آرٹ کا بہترین نمونہ ہے اور ان کے معترضین کے استدلال میں کوئی قوت نہیں۔ بہر نوع کچھ بھی ہو یہ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ محاسن کلام کی فراوانی حسن شناس نظر کو اپنے جلووں کے آغوش میں لے لیتی ہے اور نقاد کو اس کا موقع نہیں دیتی کہ وہ شاعر کی کوتاہیوں کو جو مقتضائے بشریت ہیں نمایاں کریں لہٰذا اگر تخئیل کی بلند پروازی اور زبان کی سحر طرازی کے باکمال شاعر کا طرۂ امتیاز ہو سکتی ہے تو صفی کے صاحب کمال ہونے میں کوئی شبہ نہیں جیسا کہ ابتداء میں اشارہ کیا گیا ہے۔ صفی نے لکھنؤ کی شاعری کے دونوں دور دیکھے لہٰذا ان کے کلام پر قرن اول قرن حاضر کے جملہ اثرات اور قوتیں کامرانی کر رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے قومی ترانوں اور نظموں نے اگر ہندوستان کے ہر گوشے میں ان کو چمکایا تو ان کے تغزل نے اور بالخصوص ان کے زبان زد خلائق ہزارہا نہیں تو صدہا مطلعوں نے اردو کی بزم ادب میں چار دانگ شہرت دی۔ یہ داستان ابھی بہت کچھ تشنہ شرح و بسط ہے لیکن آج وہ ہم میں نہیں لیکن ان کا کلام ہم میں زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا اور آنے والی نسلیں

ان کو نہ صرف لکھنؤ کی قدیم سلسلہ شعرا کا آخر شاعر بلکہ ہندوستان کے کامیاب ترین غزل گویوں کی صف میں نمایاں دیکھیں گی۔

صفی کا طرز شعر خوانی

صفی بڑے ترنم خیز انداز سے اور موسیقی سے بہت بچ کر شعر پڑھتے تھے جیسا کہ خود ان کے شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

بہ حسن صوت گو مرغوب ہے طرز غزل خوانی
نہ لیکن یوں کہ سمجھیں اک مغنی نکتہ داں مجکو

اس موضوع پر ذرا تفصیل سے لکھا جاتا مگر مقدمہ کے طول ہو جانے کا ڈر ہے۔

صفی کے شاگرد اور اصلاح

صفی سے اُردو اور فارسی کے کلام پر اصلاح لینے والے شاگرد کثیر تعداد میں تھے اور آج بھی بہت سے شاگرد گوشے گوشے میں زندہ ہیں جن کی فہرست بہت لمبی ہے۔ جناب تبسم مولانا صفی کے شاگرد کے خط سے معلوم ہوا کہ سات زبانوں کے ایک عالم مولانا عبدالرحمٰن صاحب بیخود ان کی وساطت سے مولانا صفی کے شاگرد ہوئے اور وہ بیک وقت مولانا صفی سے اپنے اُردو، فارسی اور عربی کے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے۔

مولانا صفی کے اصلاح دینے کا یہ طریقہ تھا کہ وہ شاگردوں کے شعروں میں صرف ایک دو لفظ بدل دیتے تھے اور اکثر کچھ باتیں بتا کر کسی مضمون کو اسی کے رنگ میں خود اسی سے نظم کرا دیتے تھے۔ میں نے چاہا تھا کہ کچھ نمونے پیش کر دوں مگر مقدمہ کے طول ہو جانے کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔

حرفِ آخر) جو کچھ جس جس ادیب کو صفیؔ کی شاعری اور بہ خصوصیت سے ان کی
غزل گوئی پر کہنا تھا کہہ چکے۔ بہت کچھ کہا گیا اور آئندہ بہت کچھ کہا جا سکے گا۔ اب
اور کچھ سوا اس کے بطور حرف آخر کہنا نہیں رہ گیا کہ صفیؔ کی غزل میں جو اہلِ ذوق مسئلہ حیات
ڈھونڈھتے تھے ان کو چاہے جس تناسب سے بھی صفیؔ کی غزل میں کچھ ملا ہو یا نہ ملا ہو
ان کی قومی اور دیگر نظموں میں افراط سے ہر طرح کے موتی بکھرے ہوئے ملتے ہیں اور
اپنی دیگر نظموں میں صفیؔ نے جن تشبیہات جدید اور استعارات نو اور تغزل کا رنگ بھر دیا
ہے وہ ممکن ہے کہ کہیں اور نہ ہوں۔ نتیجہ یہ کہ کھچڑی اور گھی دونوں ہی نے اُردو ادب کے
پیٹ میں پہنچ کر اور مل جل کر خونِ صالح پیدا کر دیا جو آئندہ اُردو ادب کا سرمایۂ حیات
ہے اور صفی جوہرِ تغزل کے تصرف کی کچھ راہیں نکال گئے اور کچھ شمعیں جلا گئے جو
خدا کرے مسافرانِ ادب کے لئے چراغِ راہ ہوں اور ان کے اور کلام کا مفید ذخیرہ
فنا اور برباد نہ ہو۔

ممتاز حسین جونپوری

۱۵/ اگست ۱۹۵۳ء

دیوانِ صفیؔ

جلد اوّل

دَورِ اوّل ۱۸۷۷ء

غش حور و پری جس پہ وہ دیوانہ ہے اُس کا
افسوں سے دل آویز تر افسانہ ہے اُس کا
دولتکدۂ عشق ہے ہر دل کا خزانہ
کب گنج سے خالی کوئی ویرانہ ہے اُس کا
محدود نہیں بارگہِ حُسن کی وسعت
معمورۂ کونین جلو خانہ ہے اُس کا
ظرفِ مے عرفاں ہے دل و دیدۂ عارف
الحق یہی شیشہ یہی پیمانہ ہے اُس کا
کس حق پہ جھگڑتے ہیں صفیؔ شیخ و برہمن
گھر کعبہ اسی کا ہے نہ بُت خانہ ہے اُس کا

۱۸۷۸ء

جو دل میں جذبِ صادق ہو تو امکاں ہے رسائی کا
تلاش یار میں کچھ غم نہیں بے دست و پائی کا
نہ اُلجھے محتسب مجھ رند سے اپنی طرف دیکھے
مری تر دامنی سے خشک ہے مُنہ پارسائی کا

زبانِ دار پر بے ساختہ شورِ انا الحق ہے
اثر دیکھو کسی آتش نوا کی ہمنوائی کا

ہم اپنے اختلاطِ روح و تن سے یہ نہ سمجھے تھے
نتیجہ زود رنجی ہو گا اس دیر آشنائی کا

پڑھا کرتے ہو اشعارِ صفیؔ مدح سنج اکثر
نکالا واہ کیا اچھا طریقہ خود ستائی کا

سنہ ۱۸۷۵ء

جو پیدا ہی نہ میں آزردہ جاں ہوتا تو کیا ہوتا
ہوا تھا خلق اگر، دل شادماں ہوتا تو کیا ہوتا

نہیں جب طاقتِ پرواز ہی دل خستہ بلبل میں
قفس پھر کیا برا ہے آشیاں ہوتا تو کیا ہوتا

میں کچھ کہتا نہیں اُس پر تو ناصح کا یہ عالم ہے
خدا جانے جو میرا رازداں ہوتا تو کیا ہوتا

وہی مجھ کو ملاتے خاک میں آخر جو ملنا تھا
ہوا تھا بے نشاں یوں بے نشاں ہوتا تو کیا ہوتا

جب اس نامہربانی پر صفیؔ یوں جان جاتی ہے
خدا جانے جو وہ بت مہرباں ہوتا تو کیا ہوتا

سنہ ۱۸۷۵ء

رگِ دل پر خدنگِ ناز مارا | یہ کس نے تیرِ بے آواز مارا
مسیحا کے تغافل کا گلہ کیا | مجھے تو نے دلِ ناساز مارا
نشاں ظاہر نہیں زخمی ہوا دل | عجب تیر اے قدر انداز مارا

صفی شکوہ ہے مجکو اپنے دل سے
کہ بن کر ہمدم و ہمراز مارا

۱۸۷۵ء

مری لحد پہ کوئی سوگوار تک نہ رہا
ہوا چلی کہ چراغِ مزار تک نہ رہا

ہوئے بھی حضرتِ ناصح تو کب کرم فرما
جب اپنے دل پہ ہمیں اختیار تک نہ رہا

جنوں میں ہم نے جہاں کی ہے جادہ فرسائی
وہاں جو دیکھئے اب کوئی خار تک نہ رہا

ہمیں فلک نے کیا اس زمیں پہ یوں برباد
کہ اپنی خاک تو کیسی غبار تک نہ رہا

اسی کے سامنے سرگوشیاں ہیں غیروں سے
صفی کا اپنے تمھیں اعتبار تک نہ رہا

۱۸۷۹ء

اک ذرا ناصحِ نافہم سمجھ کر سمجھا
خاک سمجھا دل وحشت زدہ پتھر سمجھا

فاقہ مستی میں بھی دُھن بادہ پرستی کی رہی
گردشِ بخت کو میں گردشِ ساغر سمجھا

صبح چھوٹا تو سرِ شام وہیں پھر پہونچا
ہوں وہ دیوانہ کہ زنداں ہی کو میں گھر سمجھا

اس خطا پر مجھے دوزخ میں لیے جاتے ہیں
درِ فردوس کو بھولے سے ترا گھر سمجھا

قامتِ یار ہو یا فتنۂ محشر ہو صفی
اپنی دانست میں دونوں کو برابر سمجھا

مینھ اگر برسا تو کیا کالی گھٹا چھائی تو کیا
ہجرِ ساقی میں جو میخوارو! بہار آئی تو کیا

اک نہ اک دن اے شبِ فرقت قیامت آئے گی
آج آنا ہے تو آئے کل اگر آئی تو کیا

ہم تہیدستانِ قسمت تک کب آیا دورِ جام
بزمِ ساقی میں جو مشکل سے جگہ پائی تو کیا

ہو نہ جائے فیصلہ میرا تمھارا اب یہیں
داورِ محشر کے آگے آنکھ شرمائی تو کیا

حضرتِ ناصح کی ہے تاکید بہرِ ترکِ عشق
بات بھی سمجھاتے سمجھاتے جو سمجھائی تو کیا

ہے صفی کس کو تفکر میں دماغِ فکرِ شعر
کی بھی مجبوری سے ہم نے خامہ فرسائی تو کیا

سنہ ۱۸۷۹ء

دیا گیا نئے عنوان سے اُنھیں خطِ شوق
جہاں تھا نام مرا نامہ بر نے موڑ دیا

صفی ہم ایک تو یونہی ضعیف ولاغر تھے
پھر اُس پہ روز کی فکروں نے اور توڑ دیا

سنہ ۱۸۸۰ء

سرِ طور آج بھی برقِ جمالِ یار ہو پیدا
اگر اُس منزلت کا طالبِ دیدار ہو پیدا

طریقِ عشق میں جب راہِ ناہموار ہو پیدا
تو لازم ہے زیادہ گرمیِ رفتار ہو پیدا
مجھے سمجھایئے اُس وقت آپ اے حضرتِ ناصح
کہ میری طرح دل میں عشق کا آزار ہو پیدا
وفائے وعدہ کی اُمید ہی کیا اُس ستمگر سے
کہ جس کی شوخی اقرار سے انکار ہو پیدا
صفیؔ زنداں میں ٹکراتے ہوئے سر مدتیں گزریں
الٰہی اب تو کوئی رخنۂ دیوار ہو پیدا

سنہ ۱۸۸۰ء

بہار آئی تھی جس میں وہ چمن وقفِ خزاں پایا
ریاضت کا بتا کیا تو نے پھل اے باغباں پایا
مبارک اے سرِ شوریدہ اب کیا چاہیئے آخر
ملی خاکِ درِ دلدار، سنگِ آستاں پایا
وہ چاہے سازِ مطرب یا دلِ ناسازِ عاشق ہو
جسے پایا تہی محفل میں سرگرمِ فغاں پایا
کھُلیں پر، خفتہ بختانِ چمن کی کب کھُلیں آنکھیں
چراغِ برق جب روشن قریبِ آشیاں پایا
پسند آیا صفیؔ طرزِ سخن جو ہر شناسوں کو
سمجھتا ہوں کہ میں نے اجرِ سعیِ رائگاں پایا

دَورِ دوم

سنہ ۱۸۸۱ء

سنتا ہوں ذکر تنگیِ کنجِ مزار کا
کیونکر نبھے گا ساتھ دلِ بے قرار کا

ہے موسمِ خزاں میں بھی عالم بہار کا
گلدستہ ہے لحد میں دلِ داغدار کا

کہہ دو ذرا فلک سے کہ دامن سمیٹ لے
کرتا ہوں امتحاں نفسِ شعلہ بار کا

ہم بیکسوں کی قبر کہاں برگِ گل کہاں
صدقہ ہے سب یہ فیضِ نسیمِ بہار کا

آنکھیں کئے ہوں بند پس مرگ اسلئے
سرمہ کھٹک رہا ہے شبِ انتظار کا

تا فرشِ بزمِ دوست رسائی جو ہے صفی
ہے عرش پر دماغ ہمارے غبار کا

سنہ ۱۸۸۱ء

بزم میں مجھ سے کشیدہ بتِ مغرور رہا
پاس بیٹھا تو رہا میرے مگر دُور رہا

نشۂ بادۂ توحید نہ اُترا سرِ دار
نغمہ پردازِ انا الحق لبِ منصور رہا

دمِ گلگشت نہ دامن سے کسی کے اُلجھا
سب سے خارِ سرِ دیوارِ چمن دُور رہا

تابِ نظارہ نہ لائی نظرِ عشق مگر
شعلۂ حسنِ دل افروز سرِ طور رہا

رشک اس بات پہ آتا ہے صفی سنکے مجھے
کل کسی بزم میں شب بھر مرا مذکور رہا

سنہ ۱۸۸۲ء

آہیں نہ کرے سوختہ جاں ہو نہیں سکتا
اسپند نہ دے جل کے دھواں ہو نہیں سکتا

جو حضرتِ ناصح کہیں وہ سب مجھے منظور
مجبور ہوں اک صبر تو ہاں ہو نہیں سکتا

پھرتی ہے مرے دیدۂ گریاں میں تری شکل
گو نقش سرِ آبِ رواں ہو نہیں سکتا
توبہ شکنی کا مجھے الزام گوارا
خاطر شکنِ پیرِ مغاں ہو نہیں سکتا
ہستی کو مٹا دے جو رہِ مہر و وفا میں
تا حشر وہ بے نام و نشاں ہو نہیں سکتا
ہے لطفِ سخن اور صفی لطفِ زباں اور
ہر اہلِ سخن، اہلِ زباں ہو نہیں سکتا

۱۸۸۲ء

مرے چھپائے سے کب سوزِ دل نہاں ہو گا
جہاں جلے گی کوئی شے وہیں دھواں ہو گا
جواب نہ آئے تو کیا آئیے گا پھر، جس وقت
ہمارے آپ کے قرآن درمیاں ہو گا
ہے آزمائشِ تیغ و گلو تو بسم اللہ
پھر اس کے بعد بھی کیا کوئی امتحاں ہو گا
اثر کرے گا اُسی دل پہ نالۂ بلبل
صفی جو دردِ محبت کا رازداں ہو گا

۱۸۸۳ء

یہ ناتوانی سے اب ہے نقشہ، کسی کے بیمارِ دل حزیں کا
کہ مثلِ نقشِ قدم وہ بیٹھا، جہاں کہیں ہو رہا وہیں کا

مجھے وطن سے چھڑا کے ہر سو، پھرا رہا ہے جو اے جفا جو
بتا تو دے مجکو آسماں تو، کرے گا پیوند کس زمیں کا
جہاں تک امکانِ دسترس ہو، شکستہ حالوں کے کام آؤ
کسی کا دامن پھٹا جو دیکھو، لگا دو پیوند آستیں کا
زباں سے ہنگامِ داد خواہی، مدد جو محشر میں دل نے چاہی
مری خموشی نے دی گواہی، قتیل ہوں چشمِ سرمگیں کا
صفی یہ شیریں کلام اپنا، مذاقِ بد مغز میں ہے کڑوا
جو ذوقِ فطری سے ہو معرّا، قصور کیا اس میں انگبیں کا

۱۸۸۴ء

دیدۂ اشکبار! کیا کہنا — واہ ابرِ بہار، کیا کہنا
حالِ جنت کا سُن چکے، واعظ! — اب اسے بار بار کیا کہنا
عہد نا استوار کیا کرنا — حرفِ بے اعتبار، کیا کہنا
خوب تلوے جنوں میں سہلائے — خلشِ نوکِ خار، کیا کہنا
درد نے خوب دل کا ساتھ دیا — واہ رے غمگسار، کیا کہنا
مل گئی بڑھ کے صبحِ محشر سے — اے شبِ انتظار کیا کہنا
دل سے یادِ وطن صفی نہ گئی
اے غریب الدیار، کیا کہنا

۱۸۸۵ء

آنکھ ملتے ہی رہا دل پہ نہ قابو اپنا — کر گئی کام کوئی نرگسِ جادو اپنا
انجمن پر صفتِ شمع ہے روشن احوال — دے رہا ہے خبرِ سوزِ دل آنسو اپنا
شوقِ پرواز میں پر تول کے رہ جاتا ہوں — کام دیتا نہیں ٹوٹا ہوا بازو اپنا

دولت و حشمت و عزّ و شرف و مال و منال
سب ہیں بیکار جہاں میں جو نہیں تو اپنا
سر جھکاتے ہی کھلی کیفیت اک عالم کی
ہے صفی ساغر جم، کاسۂ زانو اپنا

سنہ ۱۸۸۷ء

اک اداسی چھاگئی ہر سوختہ دل اٹھ گیا
شمع رو! اٹھنے سے تیرے حسن محفل اٹھ گیا
اب زیادہ سختیاں ہم سے نہ اٹھیں گی فلک!
بار غم تھا جس قدر اٹھنے کے قابل اٹھ گیا
ہائے جی بھر کے نہ دیکھا دل میں حسرت ہی رہی
ہائے ہم تڑپتے رہ گئے، پہلو سے قاتل اٹھ گیا
آمد صیاد کی کچھ بندھ گئی ایسی ہوا
شاخ گل سے باغ میں ہائے عنادل اٹھ گیا
بزم ساقی میں ذرا ہشیار بیٹھیں آج مست
کل یہیں پہلو سے میرے شیشۂ دل اٹھ گیا
ملک معنی میں ترا سکہ اگر بیٹھا تو کیا
اس جہاں سے جب صفی غالب سا کامل اٹھ گیا

سنہ ۱۸۸۸ء

صبحدم قطرۂ شبنم کا ہوا ہو جانا
یاد پیری میں دلاتا ہے فنا ہو جانا
یہ بتادو کہ وہ روٹھیں تو منائیں کیونکر
جن کی عادت ہے خوشامد سے خفا ہو جانا
صفی آئین محبت کی ہے شرط اوّل
جور محبوب پہ راضی بہ رضا ہو جانا

کیا قباحت جو بتوں پر دلِ ناشاد آیا
سختیاں اِن کی اٹھائیں تو خدا یاد آیا

جیتے جی سمجھے تھے مرنے پہ ملے گی راحت
جب زمیں نے ہمیں پیسا تو خدا یاد آیا

نہ گئی سر سے اسیروں کے ہوائے پرواز
اُڑ گئے ہوش جہاں سامنے صیّاد آیا

ہچکی اک آ کے صفیؔ رہ گئی کیوں وقتِ اخیر
کیا کسی زود فراموش کو میں یاد آیا

۱۸۸۸ء

پائے قاتل پہ غیر کا سر تھا
یہ بھی کمبخت کا مقدر تھا

ہم تھے اور اضطرابِ ناکامی
گرمِ ہنگامہ، نازِ دلبر تھا

لاکھ چاہا کہ اک ذرا دم لوں
دل سے مجبور ہوں کہ مضطر تھا

اُف رے جوشِ جنونِ عشق، صفیؔ
ہر نفس، دل خراش نشتر تھا

۱۸۸۸ء

خط بھیج کے دیتا ہوں یہی دل کو تسلّی
اب نامہ بر آیا ارے اب نامہ بر آیا

کیا جوش و خروشِ دلِ بیتاب کا ہو ذکر
سیلاب کی صورت جدھر آیا اُدھر آیا

ہوں منزلِ ہستی میں مگر بے خبر اتنا
یہ بھی نہیں معلوم کب آیا کدھر آیا

سنہ ۱۸۸۹ء

شور تھا حشر میں پہونچا جو ترا دیوانہ — دامن اس وقت سمیٹے رہے محشر اپنا
دل سے کھنچ کھنچ کے لہو دیدۂ تر میں آیا — شیشہ خالی ہوا لبریز رہے ساغر اپنا

دل میں لے داغ جنوں شوق سے گلکاری کر
خانہ باغ اس کو بنا اور سمجھ گھر اپنا

سنہ ۱۸۹۰ء

سینے میں آکے ناوکِ قاتل ٹھہر گیا — تسکیں کچھ ایسی دی کہ مرا دل ٹھہر گیا
ناحق نشانہ باندھ کے قاتل ٹھہر گیا — کہہ دو لگائے تیر مرا دل ٹھہر گیا
کی اختلاط میں نگہِ نازنیں کمی — نشتر پہونچ کے تا بہ رگِ دل ٹھہر گیا
لیلیٰ سے کیا تعلقِ خاطر تھا قیس کو — محمل جو چلتے چلتے رکا دل ٹھہر گیا
بابِ اثر پہ نالہ مرا حلقہ زن ہوا — دیکھا درِ کریم تو سائل ٹھہر گیا
آشوب گاہِ غم ہے مرا عافیت کدہ — محشر اٹھا وہیں سے جہاں دل ٹھہر گیا
بزمِ خیالِ عیش سے کیا کام دل کو تھا — شاید سمجھ کے یہ تری محفل ٹھہر گیا

سیمابِ کشتہ میں نہیں رہتی تپش صفی
جب سوزِ غم سے خاک ہوا دل ٹھہر گیا

سنہ ۱۸۹۰ء

قفس وہاں ہے ہم آوارہ آشیانوں کا — جہاں زمیں کا پتہ ہے نہ آسمانوں کا
پھرا ہے رخ مری جانب سے مہربانوں کا — مزاج ہی نہیں ملتا مزاجدانوں کا
بلندیوں کیلئے ہے عروج پستی سے — زمین اوج دکھاتی ہے آسمانوں کا
سنا جو قصۂ یوسف تو ہنس کے فرمایا — ضرور اس میں تصرف ہے خوش بیانوں کا
دل و دماغ کی رونق نہیں ہے بے غم و فکر — فروغ دم سے مکینوں کے ہے مکانوں کا

چمن میں آئی خزاں لو بہار رخصت ہے ریاض خاک میں ملتا ہے باغبانوں کا

سخن کی داد نہ ملنے کا غم نہیں جو صفیؔ
ملے نہ خاک میں انصاف نکتہ دانوں کا

اچھا ہوا کہ حشر کا ہنگام ہو گیا دھڑکوں سے روز روز کے آرام ہو گیا
ہم جاں بلب حضور ہیں غیروں سے ملتفت آپ اپنے کام میں ہیں یہاں کام ہو گیا
دل اوّلِ شباب ہی سے بجھ کے رہ گیا بے نور یہ چراغ سرِ شام ہو گیا
دل ٹوٹنے میں تھوڑی سی تکلیف تو ہوئی لیکن تمام عمر کو آرام ہو گیا

موئے سفید سر میں پھر اُس پر یہ غفلتیں
چونکو صفیؔ کہ صبح کا ہنگام ہو گیا

سنہ ۱۸۹۰ء

پیری میں قول ہے دلِ خانہ خراب کا جھونکا تھا نیند کا کہ زمانہ شباب کا
محفل میں سیر چشمیِ ساقی کا دَور ہے مُنہ سے لگا رہے مرے ساغر شراب کا
تاریکیِ لحد میں بیاضِ کفن کی ضو جلوہ دکھا رہی ہے شبِ ماہتاب کا
یاد آ گیا، کلی کوئی کھلتے جو دیکھ لی وہ دل کہ جس میں جوش بھرا تھا شباب کا

منظور تھیں حیا سے صفیؔ بے حجابیاں
ڈھونڈھا نگاہِ شوق نے گوشہ نقاب کا

سنہ ۱۸۹۰ء

قطرہ دریا ہے جہاں دریا میں شامل ہو گیا
ڈوبتے ہی دل میں پیکانِ ستم، دل ہو گیا
دل ہلاکِ حسرتِ بیدادِ قاتل ہو گیا
شکر، ناکامی میں بھی مقصود حاصل ہو گیا

ہے وہی اک قطرۂ خوں اسے غمِ طاقت گداز
آنکھ میں آنسو بنا سینے میں جو دل ہوگیا
اک نگاہِ مستِ ساقی نے بڑھادی قدرِ جام
آنکھ ملتے ہی دو بالا رنگِ محفل ہوگیا
ہم تک اُن کی بزم میں کس وقت پہونچا دورِ جام
خون سے لبریز جب پیمانۂ دل ہوگیا
کہہ رہی ہے شمع آنسو بھر کے ہنگامِ سحر
دیکھتے ہی دیکھتے کیا رنگِ محفل ہوگیا
ہے صفیؔ یہ محتسب کی پاک دامانی کا رنگ
بے تکلف جا کے میخانے میں داخل ہوگیا

سنہ ۱۸۹۰ء

بدگماں ہے دلِ صیاد کو بس دیکھ لیا
جب کیا بند، کئی بار قفس دیکھ لیا
گرم ہنگامۂ محشر ہے مرے نالوں سے
ہمصفیرو! اثرِ سوزِ نفس دیکھ لیا
اور کترا کے چلا ناقۂ لیلیٰ رہِ نجد
گوشِ مجنوں کو جو مشتاقِ جرس دیکھ لیا

دورِ سوم سنہ ۱۸۹۱ء

گراں باری سے عصیاں کی مرا سر اُٹھ نہیں سکتا
زمیں کہتی ہے مجھ سے اب یہ لنگر اُٹھ نہیں سکتا
دلِ بیمار کچھ حد ہے تری نازک مزاجی کی
بتوں کا ناز بھی اللہ اکبر اُٹھ نہیں سکتا

بن اے ناصح نہ رہبر کوچہ گردانِ محبّت کا
قدم تیرا اگر اِن کے برابر اُٹھ نہیں سکتا

ذرا اے بے خودی رسوا نہ کرنا بزم ساقی میں
کہ تھرّاتے ہوئے ہاتھوں سے ساغر اُٹھ نہیں سکتا

الٰہی خیر وقتِ امتحانِ دستِ نازک ہے
کٹا جاتا ہوں میں قاتل سے خنجر اُٹھ نہیں سکتا

فنائے اہلِ دل کیا ہے صفیؔ آنکھوں سے گرجانا
کہ دیکھو گر کے آنسو مثلِ گوہر اُٹھ نہیں سکتا

۱۸۹۱ء

پسند عاشقِ گریاں کا اضطراب نہ تھا
وگرنہ تشنۂ شبنم کچھ آفتاب نہ تھا

جو تو نے ساقیِ پیماں شکن ابھی توڑا
ارے وہ دل تھا مرا شیشۂ شراب نہ تھا

شبِ نشاط کا پچھلا پہر تھا اے غافل
جسے شباب سمجھتا ہے وہ شباب نہ تھا

کسی نے دل پہ صفیؔ رکھ دیا تھا انگارا
فراقِ یار میں وہ داغِ شعلہ تاب نہ تھا

۱۸۹۱ء

یہ کسی کو کیا غرض تھی کہ جو غمگسار ہوتا
ہمیں دل پہ جبر کرتے اگر اختیار ہوتا

ترے وعدے کی وفا کا مجھے اعتبار ہوتا
جو طلوعِ صبحِ محشر شبِ انتظار ہوتا

دلِ سادہ لوح اپنا یہ بتوں کا معتقد ہے
جو غلط بھی وعدہ کرتے اسے اعتبار ہوتا

کہیں روزِ حشر آتا کہ یہ سیر دیکھ لیتے
کوئی داد خواہ ہوتا کوئی شرمسار ہوتا

مری لاش کے سرہانے وہ کھڑے یہ کہہ رہے ہیں
اِسے نیند یوں نہ آتی اگر انتظار ہوتا

کہیں مثلِ شمع کُشتہ ہم اس انجمن سے اُٹھتے
کہ صفی جنازہ اپنا نہ کسی پہ بار ہوتا

سنہ ۱۸۹۲ء

وہ آئیں تا بہ قیامت، یہ اعتبار نہ تھا
سکونِ دل کا بہانہ تھا انتظار نہ تھا

فقط مقدمہ اضطرابِ دل تھا سکوں
جسے قرار سمجھتے تھے وہ قرار نہ تھا

ہوا ہے صرفِ خزاں کون برگِ لالہ و گل
جو اس چمن میں جگر گوشہ بہار نہ تھا

وہ دل جو تھا بھی تو کیا تھا ہمارے پہلو میں
جب اُس پہ زور نہ تھا کوئی اختیار نہ تھا

ہزار شکر کہ شبنم نے آبرو رکھ لی
کوئی بھی گورِ غریباں پہ اشکبار نہ تھا

پڑھا نہ فاتحہ احباب نے کبھی آکر
مگر مزار ہمارا صفی، مزار نہ تھا

۱۸۹۲ء

کون شوریدہ سری میں نہیں دشمن میرا
خود اُلجھتا ہے مرے پاؤں سے دامن میرا

بدگماں غیر سے کیوں ہے دلِ بدظن میرا
دوست کا دوست جو ہو کب ہے وہ دشمن میرا

ہم نشینانِ قفس دیکھو وہ اٹھتا ہے دھواں
پھُنک رہا ہو نہ گلستاں میں نشیمن میرا

خودکشی کی کہ ستمگر پہ نہ آئے دھبا
ہو اگر خون سے آلودہ تو دامن میرا

دشتِ غربت کی طرف اہلِ وطن جانے دیں
دیکھتا ہوگا وہاں راستہ رہزن میرا

دلِ حیراں ہے تجلی کدۂ برقِ جمال
صورتِ آئنہ ہے وادیِ ایمن میرا

گھر کے مٹنے کا مجھ آوارہ وطن کو کیا غم
گوشۂ خاطرِ احباب ہے مسکن میرا

پھر یہ کس طرح گری مجکو تعجب ہے صفی
راستے میں تو نہ تھا برق کے خرمن میرا

دَورِ چہارم ۱۹۰۳ء

کھینچ لو سینۂ مجروح سے پیکاں اپنا
دیکھ لوں دل سے نکلتے ہوے ارماں اپنا

صبح محشر بھی قریب آگئی اے ظلمتِ قبر
رات کی رات سمجھ لے مجھے مہماں اپنا

ہے یہی ضعف تو اے دستِ جنوں کیا حاصل
ہاتھ پہونچا بھی اگر تا بہ گریباں اپنا

ٹھوکریں کھانے میرے ساتھ کہاں چلئے گا
راستہ لیجئے اے خضرِ بیاباں اپنا

دیکھ کر حسنِ بتاں شانِ خدا یاد آئی
کفر کی وجہ سے کامل ہوا ایماں اپنا

مل کے تجھ سے نہ چلیں دشت میں ہم آبلہ پا
یہ طریقہ نہیں اے خارِ مغیلاں اپنا

صفی آئینۂ احوال ہیں اوراقِ سخن
دل ہی کی طرح پریشان ہے دیواں اپنا

۱۸۹۵ء

سوز و گدازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس سے فروغِ حسن تھا وہ دل نہیں رہا

اللہ رے بے حجابیِ حسن نظارہ سوز
پردہ نگاہِ شوق کا حائل نہیں رہا

دیوانگی میں بھی اُسی کوچے کی راہ لی
ہشیاریوں سے میں کبھی غافل نہیں رہا

اللہ رے بے نیازیِ قاتل کہ وقتِ ذبح
پاسِ نگاہِ حسرتِ بسمل نہیں رہا

یکساں ہوا اس جہاں میں فروغِ ہلال و بدر
کچھ امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

دورِ فلک میں جام شرابِ نشاط کا
غیر از خمارِ غم کوئی حاصل نہیں رہا

آب و ہوائے دہر خلافِ مزاج ہے
اب یہ مقام رہنے کے قابل نہیں رہا

دیتا ہے کوئی کوچۂ شہرگ سے یہ صدا
کیوں اب تو عذرِ دوریِ منزل نہیں رہا

پانی کی طرح صاف صفیؔ ہے مزاجِ دل
تھا کون رنگ جس میں یہ شامل نہیں ہوا

۱۸۹۵ء

جو وہ حُسنِ عالم آرا کہیں بے نقاب ہوتا
تو زمیں کا ذرہ ذرہ پھر اک آفتاب ہوتا

یہی نشۂ جوانی سہے بلائے زندگانی
جو شباب ہی نہ ہوتا، کوئی کیوں خراب ہوتا

دلِ زار کیا سمجھتا کششِ کمندِ اُلفت
رگِ جانِ ناتواں میں جو نہ پیچ و تاب ہوتا

یہی سبز باغِ ہستی میرے واسطے تھا جنت
جو وفا کا رنگ تجھ میں کہیں اے شباب ہوتا

تپِ غم سے جلنے والے رہے ایک عمر جلتے
یہی کیا عذاب کم تھا کہ جو پھر عذاب ہوتا

صفیؔ اس زمیں کو گردشِ ترِ چرخ یوں بھی ہوتی
کہ یہ خاکسار ہوتا، درِ بو تراب ہوتا

۱۸۹۶ء

وضعِ صفیؔ نہ پوچھو اک رندِ پارسا تھا
لب پر صنم صنم تھا دل میں خدا خدا تھا

جو دل شکستہ پا ہے پہلے گریز پا تھا
اب پاس ہے تو کیا ہے جب دُور تھا تو کیا تھا

مژگاں کے موقلم کی صورتگری جو دیکھی
ہر قطرۂ خونِ دل کا اک نقشِ مدعا تھا

ہم اور سینہ کاوی با ناخنِ شکستہ
بیکاریِ جنوں کا اک یہ بھی مشغلہ تھا

ناآزمودہ کاری اپنی ہی تھی وگرنہ
کیوں دوست اُس کو سمجھے جو دشمنِ وفا تھا

کہیئے ہمارے اس کے نبھتی تو کیونکر آخر
ہم زود رنج ٹھہرے، وہ دیر آشنا تھا

تیرِ نگہ کی تیرے اللہ رے کج ادائی
پیوست ہو کے دل میں دیکھا تو پھر جدا تھا

اے مسلکِ صفیؔ پر تنقید کرنے والو!
بیچارہ تھا غنیمت، اچھا تھا، یا بُرا تھا

سنہ ۱۸۹۷ء

مہرباں! تم نے وہ اندازِ نظر چھوڑ دیا — ہم نے اس واسطے آنا ہی اُدھر چھوڑ دیا

ہم نے اے بے خبری تجھ پہ تو گھر چھوڑ دیا — تو نے غیروں کا ہمیں دست نگر چھوڑ دیا

اب تو احباب نہ دیں گے ہمیں تکلیفِ علاج — مژدہ اے دل کہ دواؤں نے اثر چھوڑ دیا

کچھ نہ کچھ مہرِ جہاں تاب نے دلجوئی کی — گریۂ شبنم نے جو ہنگامِ سحر چھوڑ دیا

چیختے چیختے بلبل نے ذرا دم جو لیا — اک نیا تو نے شگوفہ گُلِ تر چھوڑ دیا

ہے صفیؔ، گوشۂ مرقد میں ہمارا بھی خدا
غم نہیں ساتھ احبا نے اگر چھوڑ دیا

سنہ ۱۹۰۰ء

بگڑنا یوں بھری محفل میں کیا تھا
خدا جانے کہ آب و گِل میں کیا تھا

خدا یاد آ گیا کعبے کے رستے
سوا خطرے کے ہر منزل میں کیا تھا

کھنچا جاتا تھا آخر کیوں دلِ قیس
نہ تھی لیلےٰ تو پھر محمل میں کیا تھا

بہ رسمِ شکوہ سنجی کچھ تو کھلتے
لئے رہنا یہ دل ہی دل میں کیا تھا

سوا خمیازۂ صید افگنی کے
کمانِ ابروِ قاتل میں کیا تھا

بجز گلدستہائے داغِ ماتم
طربگاہِ حریمِ دل میں کیا تھا

بتا اے خارِ خارِ لذّتِ غم
خراشِ سینۂ بسمل میں کیا تھا

ہلا عرشِ بریں تک دل تو دل ہے
خدا جانے لبِ سائل میں کیا تھا

وہی اک لذّتِ بیتابیِ شوق
وگرنہ سعیِ لا حاصل میں کیا تھا

محیطِ عشق سے اُبھرا نہ کوئی
صفیؔ! اس بحرِ بے ساحل میں کیا تھا

دَورِ چہارم — سنہ ۱۹۰۱ء

ذرّے ذرّے میں ہے جلوہ تری یکتائی کا
دلِ انساں میں جو ہو شوق شناسائی کا

ولولہ حُسن کو خود انجمن آرائی کا
نام بدنام کرشموں سے تماشائی کا

موت ہی قصد نہ کرتی جو مسیحائی کا
کون پُرساں تھا مریضِ شبِ تنہائی کا

میری خوشبو سے ہیں آزاد ہوائیں لبریز
عطرِ دامن ہوں قبائے گُلِ صحرائی کا

تا سحر چشمِ تصوّر میں رہی اک تصویر
دل سے ممنون ہوں اپنی شبِ تنہائی کا

شیر سے کون بھلا آنکھ ملا سکتا ہے
اُف وہ اندازِ نظر آپ کے سودائی کا

سامنے اُس کے ہے پیراہنِ یوسف کیا مال
قطع جامہ ہوا جس شوخ پہ رعنائی کا

جوش ہے حُسن کے دریا میں کہ طوفانِ شباب
دلکش انداز کسی شوخ کی انگڑائی کا

نکلی جاتی ہے صفیؔ پاؤں کے نیچے سے زمیں
ورنہ میں اور جنوں بادیہ پیمائی کا

سنہ ۱۹۰۵ء

نہ وہیں تھا نہ یہیں جلوۂ جانانہ جُدا
ایک پردے نے کیا کعبہ و بُت خانہ جُدا

آشنا راہ میں ہے صورتِ بیگانہ جُدا
اپنے سائے سے بھی ہاں اے دلِ دیوانہ جُدا

منزلِ شہرِ خموشاں کو جو دیکھا جا کر
ایسی بستی ہی کہ جس سے نہیں ویرانہ جُدا

جتنے بھی خمکدۂ عشق میں ہم مشرب ہیں
اُن کا پیمانہ جُدا ہے، مرا پیمانہ جُدا

کششِ حُسنِ رُخِ شمع ہے شیرازۂ عشق
ہونے پاتا نہیں پروانے سے پروانہ جُدا

دینے اُٹھا ہی کوئی مجکو اس انداز سے جام
رعشہ ہاتھوں میں جُدا، لغزشِ مستانہ جُدا

لذتِ درد کا طالب ہے ابھی اور صفیؔ
روح قالب سے نہ کر اے غمِ جانانہ جُدا

۱۹۰۸ء

دل جو ٹوٹا تو اک آنسو سرِ مژگاں نکلا
صُبحِ محشر کا ستارہ شبِ ہجراں نکلا

روح رگ رگ سے کھنچی دل سے نہ ارماں نکلا
کس مصیبت سے مرا دم شبِ ہجراں نکلا

دَور نے جب ورق اُلٹا کسی مجموعے کا
پردۂ خاک سے ہر ذرّہ پریشاں نکلا

بے قراری مری تمہیدِ سکونِ دل تھی
درد سب جس کو سمجھتے تھے وہ درماں نکلا

قامتِ حُسن پہ تھا پیرہنِ عشق جو تنگ
خاک سے ہر گُل تر چاک گریباں نکلا

مُٹھیاں جب ترے دیوانے کی کُھلوائی گئیں
خوں چکاں ہاتھ میں اک دشنۂ پنہاں نکلا

گوشِ عبرت میں غم انگیز صدائیں آئیں
جب کبھی میں طرفِ شہرِ خموشاں نکلا

کل خدا جانے کہ بیمار کی حالت کیا تھی
شب کو اِس گھر سے جو نکلا وہ پریشاں نکلا

کی جو اجزائے دلِ اہلِ جنوں کی تشریح
ایک اک ذرّے سے ایک ایک بیاباں نکلا

جس کو سمجھے تھے سُبکدوش وہی ہاتھ صفی
بتقاضائے جنوں رہنِ گریباں نکلا

سنہ ۱۹۰۸ء

گہوارۂ مرقد بھی صفی کام نہ آیا آرام نہ آیا مجھے آرام نہ آیا
جب صبح شب وصل ہوا شام کا وعدہ پھر ہوش مجھے صبح سے تا شام نہ آیا
جس کے لئے مدت سے لبوں پر ہے مرا دم افسوس نہ آنا تھا وہ پیغام نہ آیا
صد شکر کہ پوچھا تو گیا حشر میں مجھ سے قاتل کا مگر یاد مجھے نام نہ آیا
اک مست تغافل نے ذرا پھیر جو لی آنکھ محفل میں جدھر ہم تھے اُدھر جام نہ آیا

وہ سب ہے صفی دائرۂ مرگ میں شامل
جو عمر کا حصہ کہ مرے کام نہ آیا

سنہ ۱۹۰۸ء

حُسن رسوا ہو دل اِس بات پہ راضی نہ ہوا
اک نظر دیکھ لیا اُس کو جو کوئی نہ ہوا
نقشبندِ دلِ خوں گشتہ ہے ہر قطرۂ اشک
لفظ ہی کیا کہ جو صورت گرِ معنی نہ ہوا
مر گیا اُن کو پشیمانِ تغافل سُن کر
شکر، شرمندۂ احسان تلافی نہ ہوا
ہم تو بیٹھے تھے کسی تیرِ نظر کی زد پر
یہ قصورِ نظر، اندازہ جو کافی نہ ہوا
سخت جانی! مجھے پھر تجھ سے شکایت ہوگی
نہ ہوئے خون، سب ارمان تو کچھ بھی نہ ہوا
چرخ زن ہے مرے ہر ریشہ و ہر رگ میں صفی
وہی شعلہ کہ سرِ طور جو بجلی نہ ہوا

۱۹۰۸ء

دل چھُٹ کے ہم سے حسرتِ منزل میں رہ گیا
تنہا غریب وادیٔ مشکل میں رہ گیا

سوئے رقیب کس نے کیا قصدِ ناتمام
درد اُٹھتے اُٹھتے آج مرے دل میں رہ گیا

بندش سے حُسنِ غیر مقیّد کو واسطہ
دیوانہ دل پرستشِ منزل میں رہ گیا

خاطر نشینِ ہمّتِ اہلِ کرم ہوا
جو حرفِ مدّعا لبِ سائل میں رہ گیا

دیوانگانِ عشق رہے قیدِ سخت میں
اتنے دنوں کہ پاؤں سلاسل میں رہ گیا

پروانوں سے نہ شمع سے رونق ہمیں سے ہے
ہم اُٹھ گئے تو کیا تری محفل میں رہ گیا

کب اُس نے ہاتھ ذبح سے کھینچا صفیؔ کہ جب
تھوڑا سا خون شہرگِ بسمل میں رہ گیا

۱۹۰۹ء

انقلاب آ ہی گیا لو انقلاب آ ہی گیا
اُن کی باتوں میں دلِ خانہ خراب آ ہی گیا

لب پہ ذکرِ غفلتِ عہدِ شباب آ ہی گیا
صبح پیری یاد اِک بھولا سا خواب آ ہی گیا

اُف رے جوشِ گرمیِ نظارۂ طاقت گداز
دل تمام آنکھوں میں ہو کر آب آب آ ہی گیا
بن گیا ہر موئے مژگاں اک رگِ ابرِ سیاہ
دل اِدھر اُمڈا اُدھر گھر کر سحاب آ ہی گیا
نقطۂ دل میں نہ تھی گنجائشِ نقشِ جمال
مشق سے ذرے میں لیکن آفتاب آ ہی گیا
روزنِ دیوارِ جاناں آنکھ دکھلاتا ہے کیوں
غش تو پہلے ہی بقصدِ سترِ باب آ ہی گیا
چار سُو پھیلے ہوئے ہیں حلقہائے دامِ حُسن
آنکھ جب کھولی نظر اک آفتاب آ ہی گیا
ہمنشینی غیر کی اُس بزم میں کام آگئی
دَور میں ہم تک بھی اک جامِ شراب آ ہی گیا
تھی اجل انجام بیمارِ شبِ فرقت صفیؔ
کوئی کب تک جاگتا آخر کو خواب آ ہی گیا

۱۹۰۹ء

موت ہے زیست میں شرمندۂ احساں ہونا
زہر ہے درد کا منت کشِ درماں ہونا
تیری قسمت میں جو اے دل ہے پریشاں ہونا
خاک ہونا بھی تو خاکِ درِ جاناں ہونا
نیو کھودی گئی جس دن مرے کاشانے کی
جوش زن خاک کے پردے سے تھا ویراں ہونا

دلِ مایوس میں جب کوئی تمنا ہی نہیں
عینِ ساماں ہے مرا بے سر و ساماں ہونا

اے مرے قتل کا اقرار نہ کرنے والے
تجھ سے یہ کس نے کہا تھا کہ پشیماں ہونا

اے مری صبحِ وطن خندہ زنی سے باز آ
تیری قسمت میں تو ہے شامِ غریباں ہونا

اہلِ دل چاہیئے رفتارِ صفیؔ کی تقلید
نہ بہت دوڑ کے چلنا نہ پشیماں ہونا

سنہ ۱۹۰۹ء

ابھی کیا ہے کس کس کا دل خوں نہ ہوگا
ہوا ہے کسی کا یہ گردوں نہ ہوگا

کوئی سرخوشِ چشمِ میگوں نہ ہوگا
کہ جس کا فلک تشنۂ خوں نہ ہوگا

کبھی کیا یہ دنیا نہ بدلے گی کروٹ
نہ ہوگا زمانہ دگرگوں نہ ہوگا؟

بتا وادیِ نجد پھر کون ہوگا
ہوا خواہ لیلیٰ جو مجنوں نہ ہوگا

سیہ بخت ہے کون دنیا میں ایسا
جو آشفتۂ زلفِ شبگوں نہ ہوگا

ہمیں گردشِ جامِ عشرت سے مطلب؟
موافق کبھی دَورِ گردوں نہ ہوگا

نہ اُترے گا جب تک خمارِ جوانی
ہرن نشۂ چشمِ میگوں نہ ہوگا
صفی ہیچ ہے فکر موئے کمر کی
کہ باریک تر اس سے مضموں نہ ہوگا

۱۹۰۹ء

خلافِ وضع ہے اے دل اِدھر جانا اُدھر جانا
وہیں کچھ کھا کے سو رہنا اُسی چوکھٹ پہ مر جانا
دلِ خوں گرم میں اللہ رے مدّوجزرِ بیتابی
کبھی پارے کا چڑھ جانا کبھی چڑھ کر اُتر جانا
کہیں ہو مرکزِ جذبِ محبت دیر یا کعبہ
جدھر دل خود بخود کھنچنے لگے مجکو اُدھر جانا
جدائی تم سبھوں کی شاق ہے لو ہم بھی چلتے ہیں
ٹھہر جانا ذرا اے قافلے والو! ٹھہر جانا
تعلق بڑھ گیا ہے رہتے رہتے اس قدر دل کا
کہ زنداں سے پلٹ کر اب ہمیں کھلتا ہے گھر جانا
وہ میری بیکسی وہ وادیٔ غربت کا سنّاٹا
نہ آنا کچھ نظر ہر چند کوسوں تک نظر جانا
خمیر اس کا صفی شاید کہ تھا ریگِ بیاباں سے
وہ گر کر ٹوٹنا اور دل کے ذرّوں کا بکھر جانا

سنہ ۱۹۱۰ء

شعبدہ تھا آفتابِ حُسن عالمگیر کا
شیشۂ دل میں اُتر آنا تری تصویر کا

ہم سے پوچھے کوئی تاریخِ تجلّی گاہِ ناز
کوہِ طور اک سنگِ بنیادی ہوا اس تعمیر کا

دست و بازو پر ذرا نازاں نہ ہولے کوہکن
بوئے خوں دیتا ہے نقشِ تازہ جوئے شیر کا

عالمِ اسباب ہے یا آہنی کڑیوں کا ڈھیر
ڈھونڈھیئے لیکن سرا ملتا نہیں زنجیر کا

پیش پا اُفتادہ ہے خضر و سکندر کی مثال
حل ہوا تدبیر سے کب مسئلہ تقدیر کا

دل نے جب چشمِ مآل اندیش سے دیکھا صفی
عارضی ہی نقش تھا ہر خوشنما تعمیر کا

سنہ ۱۹۱۰ء

روتے ہوئے ہر مونس و غمخوار کو دیکھا
دیکھا نہ گیا جب ترے بیمار کو دیکھا

بیرحمیِ صیادِ جفا کار کو دیکھا
بیچارگیِ مُرغِ گرفتار کو دیکھا

ہر چار طرف دشت میں اک آگ لگی تھی
کیوں خضر مری گرمیِ رفتار کو دیکھا

تیری نگہِ ناز نے کیوں برقِ تجلّی
بے مانگی طالبِ دیدار کو دیکھا

زنداں میں ہوئی عید اسیرانِ کہن کو
آتے جو کسی تازہ گرفتار کو دیکھا

پہونچے جو کبھی عرضِ تمنا کی غرض سے
تقریر سے پہلے نگہِ یار کو دیکھا

سیرِ چمنِ خلد کی پروا اُسے کیا ہو
جس نے کہ صفی کوچۂ دلدار کو دیکھا

سنہ ۱۹۱۰ء

غنیمت جانئے اے رہروانِ عشق دم میرا
چراغِ منزلِ ہستی ہے ہر نقشِ قدم میرا

کشش وہ کون تھی جس نے مجھے پہونچا دیا تم تک
ارادہ سا کنانِ دیر تھا سوے حرم میرا

تمھاری بزمِ شاہانہ کے اک گوشے میں بیٹھا ہوں
ذرا رکھنا خیال اے ساقیانِ جامِ جم میرا

کل اس شب کی سحر کیا جانئے کیسی آنے والی ہے
صفیؔ کچھ شام ہی سے آج گھبراتا ہے دم میرا

سنہ ۱۹۱۰ء

موقع نہیں ہے طور پہ عرضِ نیاز کا
موسیٰ یہ راستہ ہے نشیب و فراز کا

آشفتگانِ زلف کے پیشِ نگاہ ہے
جادہ جنابِ خضر کی عمرِ دراز کا

بیٹھا ہوں بزمِ ناز میں سب سے علیحدہ
اُمیدوار اک نگہِ امتیاز کا

ختم آخری علاج بھی جھنجلا کے ہو کہیں
احسان ایک اور سہی چارہ ساز کا

اربابِ کبر و ناز سے ملتا نہیں صفیؔ
بندہ نیاز مند ہے اک بے نیاز کا

دورِ پنجم
سنہ ۱۹۱۱ء

ساز و برگِ عشرتِ اہلِ تمنا جل گیا
سوزِ غم سے خونِ دل میں جس قدر تھا جل گیا

سُن رہا ہوں حُسن نے کی خانہ سوزی عشق کی
یہ خبر لیکن نہیں کیا رہ گیا کیا جل گیا

جام بر کف خرقہ بر دوش آئے جب مسجد میں ہم
بوئے صہبا سے دماغِ اہلِ تقوا جل گیا

طرح غالب یہ صفی ایسی زمینِ شور ہے
جو ہوا اس میں عرق ریزی سے پیدا جل گیا

۱۹۱۱ء

جو یہی تھی رسمِ دنیا تو وہاں مزار ہوتا
کہ جہاں کا ذرہ ذرہ دلِ بے قرار ہوتا

شبِ وعدہ کس مزے سے یونہی صبح تک گزرتی
اُدھر اہتمام ہوتا اِدھر انتظار ہوتا

کوئی زہر پی بھی لیتا تو وہ دل لگی سمجھتے
کوئی جان دے بھی دیتا تو نہ اعتبار ہوتا

وہ لہو کا قطرہ جس سے کہ دھواں سا اُٹھ رہا ہے
دلِ سنگ جذب کرتا تو یہی شرار ہوتا

صفی اس طرح کسی نے مرے دل میں چٹکیاں لیں
کہ نہ بے قرار ہوتا تو یہ بیقرار ہوتا

لحدِ صفی پہ ہوتا کسی شب مشاعرہ بھی
وہی شمع اک جلاتا کہ جو سوگوار ہوتا

۱۹۱۲ء

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا
قفس لے اُڑوں میں ہوا اب جو سنکے مدد اتنی اے بالِ پرواز دینا
کرے دل کا بیوپار کیا اُن سے کوئی بصد شوق لینا، بصد ناز دینا

نہ خاموش رہنا مرے، ہمصفیرو! جب آواز دوں تم بھی آواز دینا
کوئی سیکھ لے دل کی بیتابیوں سے ہر انجام میں رنگِ آغاز دینا
دلیل گراں باریِ سنگِ غم ہے
صفی ٹوٹ کر دل کا آواز دینا

۱۹۱۲ء

اُٹھ گئے خود اہل جوہر ذکرِ جوہر رہ گیا
نقشِ ہستی مٹ گیا نامِ سکندر رہ گیا
بڑھتے بڑھتے ہوں گے دامنگیرِ ساقی دستِ شوق
آتے آتے دَورِ محفل میں جو ساغر رہ گیا
بڑھ گیا تیری بدولت چارہ گر لطفِ خلش
تیر یوں کھینچا کہ پیکاں دل کے اندر رہ گیا
یہ کھٹک، پہلے تو آہ نیمکش تجھ میں نہ تھی
دل کی رگ میں ٹوٹ کر کیا کوئی نشتر رہ گیا
صفحۂ ہستی نہیں بازیچۂ اطفال ہے
ایک نقش اِس پر بنا اور ایک مٹ کر رہ گیا
جاتے جاتے وہ سرِ گورِ غریباں رک گئے
اُٹھتے اُٹھتے فتنۂ آشوبِ محشر رہ گیا
قوتِ جذبِ نگاہِ مستِ ساقی دیکھنا
جو ہر مے کھنچ گیا ساغر ہی ساغر رہ گیا
کاٹنا فرقت کی راتیں کچھ صفی آساں نہ تھا
رہ گیا زندہ نہیں معلوم کیوں کر رہ گیا

سنہ ۱۹۱۳ء

پالیا جو پانا تھا کیا بتائیں کیا پایا
نقدِ نا روا پایا، بختِ نا رسا پایا

موسمِ جنوں زا کا نبض سے پتا پایا
خونِ تازہ رگ رگ میں آج دوڑتا پایا

دلربا نے دل پایا دل نے دلربا پایا
کھو کے دل یہ خوش ہیں ہم جیسے کچھ پڑا پایا

ضبط کی کوئی حد ہے، انتہا تحمّل کی
غم نے دل کو جب چھیڑا سازِ بے صدا پایا

تم سے ہم نہ کہتے تھے کیوں وہی ہوا آخر
توڑ کر کسی کا دل یہ بتاؤ کیا پایا

شامِ ہجر آتے ہی کیا ہوا خدا جانے
دم رُکا ہوا دیکھا، دل بجھا ہوا پایا

ڈھونڈھتے صفیؔ کل تھے گم گئے ہوئے دل کو
کہیئے کچھ خبر پائی کہیئے کچھ پتا پایا؟

سنہ ۱۹۱۳ء

تھی فکرِ نام ہم کو نہ شوقِ نمود تھا
تھے بھی تو کیا، عدم کے برابر وجود تھا

اُس عہد میں نہ عشق کا بھی جب وجود تھا
جز حُسن کون آئنہ دارِ شہود تھا

کھلتا نہیں وجود میں آئے عدم سے کیوں
جب معرضِ عدم میں ہمارا وجود تھا

قربانِ قیدِ ہستیِ دیوانگانِ عشق
خود جذبِ حُسن سلسلہ بندِ قیود تھا

جس دن پڑی صنم کدۂ حُسن کی بنا
لوحِ جبینِ عشق پہ نقشِ سجود تھا

دیکھا نظامِ آمد و رفتِ نفس بغور — عالم تمام کار گہِ تار و پود تھا
موقوف جس پہ گرمیِ ہنگامہ تھی وہ دل — محض اک طلسمِ شعلۂ طومارِ دود تھا
دل سے زیادہ داغ پہ تھی حسن کی نظر — جب عشق سے معاملۂ اصل و سود تھا
وحشی پہونچ گئے درِ زنداں کے متصل — ہنگامہ کشاکشِ بست و کشود تھا
آرائشِ مناظرِ کثرت سے فائدہ؟ — اتنا تو تنگ دائرۂ ہست و بود تھا

جب درس خوانِ فلسفۂ عشق تھے صفیؔ
جوشِ جنوں منافیِ حفظِ حدود تھا

۱۹۱۶ء

پیری میں کیا خبر تھی عہدِ شباب ہوگا
دنیائے عافیت میں ایک انقلاب ہوگا
کاشانۂ گدا ہو، یا قصرِ بادشاہی
یہ بھی خراب ہوگا، وہ بھی خراب ہوگا
یہ نازک آبگینہ کیونکر ہوا سے ٹوٹا
پہلو میں دل نہ ہوگا، کوئی حباب ہوگا
اُلفت کے امتحاں میں سختی سے ڈر نہ اے دل
ناکامیاب ہوکر پھر کامیاب ہوگا

اس خاکداں میں رہ کر کس کو صفیؔ خبر تھی
ایک ایک ذرہ اس کا ایک آفتاب ہوگا

۱۹۱۹ء

سنبھلے نہ تھے کہ آگیا موسم بہار کا — اب کیا بھرے گا زخم دلِ بیقرار کا
وہ اختیار کے ہیں نہ یہ اختیار کا — نازک معاملہ ہے دلِ بیقرار کا

ہیں عالمِ سکوت میں بھی تر زبانیاں گویا کہ زمزمہ ہوں لبِ آبشار کا
زاہد لباسِ زہد میں دھبہ لگا نہ دے ہلکا سا رنگ چشمِ بُتاں کے خمار کا
بو خوشگوار، رنگ نہایت نظر فریب پھل تلخ ہے مگر چمنِ روزگار کا
جوش و خروشِ کشمکشِ لذت و الم یہ فلسفہ ہے زندگیِ مستعار کا
کمبخت بڑھ کے صبحِ قیامت سے مل گئی دیکھا فریب تم نے شبِ انتظار کا
دیکھیں تو آئنہ ہے دلِ حق نما صفی
توڑیں تو اک طلسم ہے گرد و غبار کا

سنہ ۱۹۱۹ء

دل بیچ کے یوسف سے ہے خریدار کسی کا کیا نامِ خدا گرم ہے بازار کسی کا
یہ عشق کا نیرنگ ہے وہ شعبدہ حُسن صحرا جو کسی کا ہے تو گلزار کسی کا
مسلک دلِ وارفتہ کا آزادہ روی ہے بیزار کسی سے نہ طرفدار کسی کا
آشفتۂ گیسو نہیں پابندِ علائق آزاد ہے دنیا سے گرفتار کسی کا
رودادِ کلیم آپ صفی سُن ہی چکے ہیں
پھر کیا ہو کوئی طالبِ دیدار کسی کا

دورِ ششم

سنہ ۱۹۲۱ء

زندہ بچا کہ راہِ طلب میں فنا ہوا اک دل تھا وہ غریب خدا جانے کیا ہوا
بے پردہ حُسنِ ذات کا جلوہ محال تھا آئینۂ صفات میں صورت نما ہوا
دنیا کے ساتھ ساتھ ہیں دنیا کے واقعات جو آج ہو رہا ہے یہی بارہا ہوا
روحِ نشاط پردۂ آواز ہی میں ہے بیکار ہے یہ سازِ جہاں بے صدا ہوا
پیدا ہی ذرے ذرے سے اک جوشِ انتقام کس دردمند پر ستمِ ناروا ہوا

زندانیٔ حیات کو یہ بھی خبر نہیں بیچارہ کب اسیر ہوا کب رہا ہوا
جنت ہے صحبتِ مے و معشوق ہی کا نام لیکن جو رند ہو نہ سکا پارسا ہوا

اِن زاہدانِ خشک کے پہلو میں بھی صفیؔ
دل ہے، مذاقِ عشق سے لیکن گرا ہوا

سنہ ۱۹۲۲ء

نگاہِ گرمِ گلچیں نے مٹا ڈالا نشاں میرا
کبھی آنکھوں کا تارا تھا چمن کی آشیاں میرا
مری ریشہ دوانی سے بڑھی بیداریٔ گلشن
ستم یہ ہے کہ پھر بھی بیخکن ہے باغباں میرا
وہ خوابِ ناز پر آمادہ ہیں افسانہ کیوں چھیڑوں
اُڑا دیتا ہے نیند آنکھوں سے لطفِ داستاں میرا
قفس میں ہوں مگر دل کو چمن سے اک تعلق ہے
مری آنکھوں میں پھرتا ہے ابھی تک آشیاں میرا
صفیؔ میں اک مسافر ہوں نہ میرا راستہ روکو
سرِ منزل پہونچ کر منتظر ہے کارواں میرا

سنہ ۱۹۲۴ء

جنوں خیز حسنِ گُل اُفشاں تمہارا بہاریں تمہاری گلستاں تمہارا
چلیں جانفزا عطر پرور ہوائیں کھُلا گیسوئے عنبر افشاں تمہارا
کرو ترکِ خلوت سرِ بام آؤ کہ ہے منتظر ماہِ تاباں تمہارا

صفیؔ تم اُلجھتے ہو دستِ جنوں سے
ہنسے کیوں نہ چاکِ گریباں تمہارا

سنہ ۱۹۲۴ء

رہینِ لطف ہوں ایسے جنونِ فتنہ ساماں کا
جسے دامن کی اٹکل ہے نہ اندازہ گریباں کا

دلِ خوابیدہ چونک اُٹھے گا آنکھیں بند ہونے پر
کہ ہستی دوسرا اک نام ہے خوابِ پریشاں کا

نگارستانِ رنگِ بیخودی ہے میرا میخانہ
دلِ روح القدس شیشہ ہے لیکن طاقِ نسیاں کا

رہا کرتے ہیں لبریزِ نوا پردے ستاروں کے
چھڑا رہتا ہے اُس محفل میں سازِ اسرارِ پنہاں کا

کہیں بہتے ہوے دریا کا رُخ پیچھے پلٹتا ہے
دلِ شوریدہ کیوں مشتاق ہے عمرِ گریزاں کا

ہنسی آتی ہے حُسن و عشق دونوں کی شکایت پر
گلہ یوسف کو دامن کا زلیخا کو گریباں کا

گلا کٹوا کے بھی پایا نہ آرامِ سُبکدوشی
سر اُترا بار لیکن بڑھ گیا قاتل کے احساں کا

یہ پامالی ہے گویا سرفرازی کا مجھے خلعت
صفیؔ وہ سبزۂ خوابیدہ ہوں گورِ غریباں کا

سنہ ۱۹۲۶ء

دل سے دل تک نزع میں کچھ نامہ و پیغام تھا
آمد و رفتِ نفس کا ورنہ پھر کیا کام تھا

کچھ نہ تھا خواب پریشاں تھا خیال خام تھا
زندگی سمجھے تھے جس کو موت کا پیغام تھا
وہ فروغِ بزمِ عشرت وہ طلوعِ جامِ جم
کچھ نہ تھا خالی فریبِ گردشِ ایام تھا
کم نہ تھا فرقت کی شب سے ہجر کا روزِ سیاہ
صبح کا تارا تنک پر تو چراغِ شام تھا
جب بندھے بازو کھلا ہم پر کہ دھوکا کھا گئے
سمجھے تھے دانا جسے ہم وہ فریب دام تھا
جان جائے اور کوئی پوچھنے والا نہ ہو
ایک ناکامِ محبت کا یہی انجام تھا
کیا خبر تھی انقلابِ دہر کی ہم کو صفی
قبر کا گوشہ بظاہر گوشۂ آرام تھا

سنہ ۱۹۲۶ء

جب صفی ذکرِ حریفانِ مے شام آیا — سب سے پہلے لبِ ساقی پہ مرا نام آیا
بے قراری دلِ بیمار کی اللہ اللہ — فرشِ گل پر بھی نہ آنا تھا نہ آرام آیا
چہچہے بھول گئے نغمہ سرایانِ چمن — اُڑ گئے ہوش جو صیاد لئے دام آیا
جورِ درباں کی تو کچھ بھی نہ ہوئی تحقیقات — میرے ہی سر مری فریاد کا الزام آیا
ابھی کروٹ بھی نہ بدلی تھی لحد میں کہ صفی
صور کی آئی صدا حشر کا ہنگام آیا

۱۹۲۸ء

جا کے جب تازہ مزاروں پہ چراغاں کرنا
ایک ٹوٹی ہوئی تربت پہ بھی احساں کرنا

دیکھ لوں دُور سے تصویرِ شبابِ رفتہ
رُخ اِدھر بھی کبھی اے عمرِ گریزاں کرنا

عقدۂ دل کی کشایش ہمیں منظور نہ تھی
ورنہ دشوار نہ تھا گھر کا بیاباں کرنا

نہ کیا غنچے نے کس طرح قبائے گُل کو
حیرت انگیز ہے دامن کا گریباں کرنا

حُسنِ یوسف پہ نہ تھی عشقِ زلیخا کی نظر
چاہتا تھا مگر آرائشِ زنداں کرنا

زندگی نام اِسی کا ہے اگر غور کریں
مشکلیں پیش جو آئیں اُنھیں آساں کرنا

دمِ تعمیر صد افسوس نہ سمجھے یہ صفی
گھر کا آباد ہی کرنا تو ہے ویراں کرنا

۱۹۲۹ء

رازِ ہستی آکے عالم آشکارا کر دیا
موت نے حل زندگانی کا معمّا کر دیا

بعدِ مُردن جب رواداراِ آہ کوئی بھی نہ تھا
اپنا آغوشِ محبت خاک نے وا کر دیا

جیتے جی ہم نے لگائی لب پہ اک مہرِ سکوت
خود چراغِ زندگی خاموش گویا کر دیا
حسن! تیرا معجزہ ناقابلِ انکار ہے
بوئے پیراہن سے نابینا کو بینا کر دیا
جب تماشا گاہِ فطرت میں مری آنکھیں کھلیں
عقل نے پیغامِ خودداری مجھے لا کر دیا
یوں کیا انساں کو زندانِ علائق میں اسیر
ہر طرف سامانِ دلچسپی مہیا کر دیا
دل کو لائے تھے صفی اک جلوہ گاہِ ناز تک
پھر نہیں معلوم اُسے لا کر وہاں کیا کر دیا

دورِ ہفتم ۱۹۳۱ء

مدعا مسجد سے کیا مقصود بُت خانے سے کیا
قیدِ مذہب کو علاقہ تیرے دیوانے سے کیا
بے زباں کے تن بدن میں لگ گئی اک آگ سی
شمع تو نے کہہ دیا محفل میں پروانے سے کیا
ترکِ الفت ناصحِ ناداں بھلا کچھ خیر ہے
وضع اپنی چھوڑ دوں میں تیرے سمجھانے سے کیا
جوشِ وحشت لے چلا ہے کیوں بیاباں کی طرف
فائدہ ناحق مجھے کانٹوں میں اُلجھانے سے کیا

ہوشیاری میں کہاں لطفِ سکونِ بیخودی
پھر صفی آخر نتیجہ ہوش میں آنے سے کیا

سنہ ۱۹۳۲ء

مآلِ غفلتِ عہدِ شباب دیکھ لیا
کہ آنکھ کھلتے ہی ایک انقلاب دیکھ لیا
دکھاؤں کون سی حالت اُنھیں بتا دلِ زار
سکون دیکھ لیا، اضطراب دیکھ لیا
گرا کوئی سرِ دامانِ طور تیورا کے
ذرا جو شعلۂ برقِ عتاب دیکھ لیا
خجل تھا کثرتِ عصیاں سے ناگہاں دل نے
اشارۂ کرمِ بے حساب دیکھ لیا
نگاہِ ناز نے تاکا جسے وہ بسمل تھا
سلیقۂ نظرِ انتخاب دیکھ لیا
اب اے محیطِ فنا رہ کے اور کیا دیکھیں
جو دیکھنا تھا وہ مثلِ حباب دیکھ لیا
ذرا کلیم کا شانہ ہلا کے پوچھ تو لوں
کہو سوال کا اپنے جواب دیکھ لیا
صفی خرابۂ دنیا کو دیکھتے کیا خاک
بلند و پست جہانِ خراب دیکھ لیا

سنہ ۱۹۳۲ء

پیشِ نظر تھا جو سماں کچھ بھی نہ تھا وہ خواب تھا
آنکھ کھلی تو کب کھلی سر پہ جب آفتاب تھا
خندۂ برقِ حسن میں، شائبۂ عتاب تھا
جل گیا طور اور ابھی جلوہ تہِ نقاب تھا
نقطۂ دل بنا کے جب چشمِ کرم نے کی نظر
قطرے میں بحرِ بیکراں ذرّے میں آفتاب تھا
تھا وہ مریضِ عشق کی چینِ جبیں سے آئنہ
صورتِ زلفِ خم بخم دل میں جو پیچ و تاب تھا

بن کے لہو جو بہہ گیا خوب ہوا بلا کٹی
سینے میں اپنے دل نہ تھا جان پر اک عذاب تھا

شانِ مزاجِ حسن بھی آئی سمجھ میں کچھ کلیم
باتوں میں بے تکلفی، دید میں یہ حجاب تھا

مثلِ غبار جب اٹھا پیکرِ خاکیِ صفی
ہاتھ میں وقتِ نفخِ صور دامنِ بوتراب تھا

۱۹۳۲ء

بھری بہار میں یہ جورِ باغباں دیکھا
چمن میں پھونک دیا جو بھی آشیاں دیکھا

کبھی بہار کبھی موسمِ خزاں دیکھا
یونہی بدلتے ہوئے رنگِ آسماں دیکھا

نظر فریب تماشائے گلشنِ ہستی
ہزار دیکھ چکے ہیں مگر کہاں دیکھا

سمجھ کے صیدِ زبوں تم نے جس کو چھوڑ دیا
اُسے ہلاکِ تمنائے امتحاں دیکھا

سرِ نیاز جھکا خود بخود اُسی جانب
جہاں کہیں قدمِ دوست کا نشاں دیکھا

جنابِ خضر کو پہلے سمجھتے تھے آزاد
مگر اسیرِ غمِ عمرِ جاوداں دیکھا

اُسی کو بڑھ کے گلے سے لگا لیا ہم نے
جسے بھی دردِ محبت کا رازداں دیکھا

عجب نہیں کوئی سرگشتۂ محبت ہو
بگولا ایک پسِ گردِ کارواں دیکھا

جفائے چرخ یہاں تک بڑھی صفی صد شکر
کہ مہرباں جو نہ تھا اُس کو مہرباں دیکھا

۱۹۳۳ء

وجہِ جمعیتِ خاطر سر و ساماں نہ ہوا
دل ہوا اور پریشاں جو پریشاں نہ ہوا

فصلِ گل پھول چڑھانے سرِ تربت آئی
وہ چمن ہوں جو اجڑنے پہ بھی ویراں نہ ہوا

میری زنجیر مرے بعد کسی نے پہنی
یوں مگر جوشِ جنوں سلسلہ جنباں نہ ہوا

ہو ستم سے کوئی نادم تو شکایت بھی سہی اور بالفرض وہ ظالم جو پشیماں نہ ہوا

سرد مہری کا زمانے کی وہ کشتہ ہوں صفی
ٹوٹ کر سنگ لحد بھی شرر افشاں نہ ہوا

۱۹۳۴ء

دل مٹ گئے نشانِ غمِ دنیا نہ رہے گا
دامانِ عناصر پہ یہ دھبا نہ رہے گا

ہنگامہ یہ پھر حسنِ خود آرا نہ رہے گا
جب کوئی ترا چاہنے والا نہ رہے گا

ہو جل کے اگر خاک سراپردۂ ہستی
پھر بیچ میں حائل کوئی پردا نہ رہے گا

سر نذر ہے لیکن بتِ سفاک مرے بعد
کیا اس کی ضمانت کہ یہ سودا نہ رہے گا

جب ہم نہ رہے کچھ بھی رہے کیا ہمیں مطلب
دنیا ہے یہ رہنے کو یہاں کیا نہ رہے گا

جو دردِ محبت کا نتیجہ ہے وہ معلوم
قابو میں صفی دل نہ رہے گا نہ رہے گا

دورِ ہشتم ۱۹۴۲ء

مری نظر سے نظر دل سے دل ملائے جا
ترے نثار یہ پیمانہ یونہیں پلائے جا

اسی طرح ابھی اے انقلاب آئے جا
رہے سہے جو نشاں ہیں اُنھیں مٹائے جا
جفائے حسن سے نالاں نیاز مندیِ عشق
وفا کا دل سے تقاضا کہ ناز اُٹھائے جا
لبوں پہ موجِ تبسم، نگاہ قہر آلود
دلِ حزیں پہ یونہیں بجلیاں گرائے جا
یہ دیکھ جب، کہ صف آرا سپاہِ مژگاں ہے
اُمیدِ فتح پہ اے دل شکست کھائے جا
پسندِ اہلِ زمیں ہے مذاقِ طفلانہ
سپہرِ شعبدہ گر شعبدے دکھائے جا
ابھی ہے تجھ سے بہت دور منزلِ مقصود
ٹھوکرے دیتی ہے غیرت قدم بڑھائے جا
دلوں پہ نقشِ محبت بٹھا تو ہے اک بات
لبوں پہ مُہر لگائی تو کیا لگائے جا
یہی علاج ہے بالکل اسی کا نام ہے صبر
کہ چوٹ کھائے ہوئے دل پہ چوٹ کھائے جا
شکست دل کی صدائیں صفیؔ تلخ نوا
زمانہ گوش بر آواز ہے سُنائے جا

۱۹۴۴ء

شکوۂ ناکامیِ قسمت بھی کام آ ہی گیا
منفعل نظروں سے ہم تک دورِ جام آ ہی گیا

کس قدر کترے ہیں گُل ان کے خرامِ ناز نے
فتنۂ محشر بھی آخر زیرِ دام آہی گیا

رہروانِ عشق کو ہے کوہِ طور اک سنگِ راہ
یہ نہ سمجھیں قربِ جاناں کا مقام آہی گیا

عقل کا ہے پختہ کارانِ جنوں میں اب شمار
رفتہ رفتہ جوش میں سودائے خام آہی گیا

آزمانے طاقتِ دیدار اک محشر خرام
لن ترانی کہہ کے خود بالائے بام آہی گیا

ضبط سے تنگ آ کے کھینچی دل نے آہِ نیمکش
وقتِ آخر لب پہ حرفِ ناتمام آہی گیا

انتظارِ دَورِ ثانی کب تک اُٹھئے اے صفیؔ
دَورِ اوّل تا بحدِ اختتام آہی گیا

دَورِ دوم سنہ ۱۸۸۱ء

ہجر میں بھی بخشتا ہے لطفِ وصلِ یار خواب
پھر اِن آنکھوں کو دکھا اے طالعِ بیدار خواب

نیند اُڑ جاتی ہے سُنتا ہوں بدل جائے جو گھر
آ گیا کُنجِ لحد میں کیوں مجھے اک بار خواب

پا کے میرے دیدۂ بیدار کو مُشتاقِ دید
سات پردوں میں چھپاتا ہے شبیہِ یار خواب

سچ کہا ہے یہ جوانی کی بُری ہوتی ہے نیند
شام ہی سے یار کی آنکھوں میں ہے سرشارِ خواب
عالمِ مستی میں بندھ جاتے نہیں کیا کیا خیال
دیکھتا ہے عینِ بیداری میں ہر میخوارِ خواب
ہے ضرر سالک جو غافل ہو طریقِ عشق میں
کھائے گا ٹھوکر جسے آیا دمِ رفتارِ خواب
عارض و گیسو کے سودے میں نہیں یکسو جو دل
روز و شب کو دیکھتا ہوں میں صفیؔ دو چار خواب

دورِ ہشتم ۱۹۴۶ء

غافلو! مرگِ مفاجات ہے انجامِ شراب
کیوں ہو اِس درجہ اسیرِ ہوسِ جامِ شراب
طائرِ ہوش کا پھنسنا کوئی دشوار نہیں
موجیں ساغر میں بچھائے ہوئے ہیں دامِ شراب
بے پیئے مست ہیں زہّاد ریا کار مگر
رندِ مشرب ہیں فقط موردِ الزامِ شراب
طاقِ نسیاں پہ چُنا شیشوں کو اُن کے میں نے
جتنے میخانوں میں پائے گئے اقسامِ شراب
سرخوشِ بادۂ تلخِ غمِ ہجراں ہوں صفیؔ
دلِ ناکامِ محبت نہیں ناکامِ شراب

دورِ دوم ۱۸۸۱ء

سب سُنا کرتے ہیں مجھ سے داستانِ کوئے دوست
میں ہوں گویا عندلیبِ بوستانِ کوئے دوست

ناتوانی سے جو چل سکتا نہیں، با چشمِ یاس
گِن رہا ہوں نقشِ پائے سالکانِ کوئے دوست

بارہا بلبل سے مجھ سے بحث گلشن میں رہی
وہ ثنا خوانِ چمن میں مدح خوانِ کوئے دوست

آستانِ یار کے بدلے نہ کی جنت قبول
ہم سے بڑھ کر کون ہوگا قدردانِ کوئے دوست

ہے بہت جاں بخش سُنتا ہوں ہوائے کوئے یار
جان دے کر اب کروں گا امتحانِ کوئے دوست

نام اگر اہلِ نجف پوچھیں تو کہہ دوں گا صفیؔ
بوترابی خاکِ پائے رہروانِ کوئے دوست

۱۸۸۲ء

بزم میں دیکھا اگر دشمن کو ہم پہلوئے دوست
یہ گراں گذرا نظر اٹھی نہ اپنی سوئے دوست

کعبہ زاہد کو مبارک برہمن کو بتکدہ
ہم تو عاشق ہیں ہمیں دیر و حرم ہے کوئے دوست

جذبِ دل کی ضعف میں تاثیر اُلٹی ہوگئی
ناتوانی سے کھنچا جاتا ہوں از خود کوئے دوست

پا بہ زنجیر ایک دیوانہ پری کے ساتھ ہے
ہوش اُڑا کر لے چلی ہے نکہتِ گیسوئے دوست

کون سی اُمید ہے صحبت بر آ رہی کی صفی
شیشۂ نازک مرا دل سنگِ خارا خوئے دوست

دورِ پنجم ۱۹۱۱ء

رفتہ رفتہ روح شاید کھنچ رہی ہے سوئے دوست
دے رہا ہے میرے ہاتھے کا پسینہ بوئے دوست

وجد میں باتیں ہوا سے کر رہے ہیں دیکھنا
پھول سے چہرے پہ لہرائے ہوئے گیسوئے دوست

اک چراغِ قبر تیرا منتظر ہے دیر سے
کوئی جھونکا اس طرف بھی اے نسیم کوئے دوست

بند بھی ہونے لگیں آنکھیں مریضِ عشق کی
ہے نگاہِ واپسیں لیکن ابھی تک سوئے دوست

اے جنونِ عشق اس جذبِ تصور کے نثار
باغ میں ہر خار و گل سے آ رہی ہے بوئے دوست

مستمندانہ چلو تم بھی صفی بہرِ طواف
قبلۂ ہر دانیاں ہے کعبۂ مشکوئے دوست

دورِ ہشتم ۱۹۴۶ء

موجزن برق صفت جام میں جم کی میراث
نام مورث ہی کا چمکانے کو چمکی میراث

یہ ترے میکدے کے خیر طلب ہیں ساقی
دے گداؤں کو بھی شاہانِ عجم کی میراث

جس قدر چھوڑ گئے حضرتِ آدم پسِ مرگ
آئی حصے میں ہمارے ہی وہ غم کی میراث

رونق افروز ہیں کعبے سے نکالے ہوئے بُت
آگئی دیر کے قبضے میں حرم کی میراث

کیا چم و خم ہے کسی جنبشِ ابرو میں صفیؔ
اس نے پائی ہے مگر تیغِ دو دَم کی میراث

دورِ ہشتم ۱۹۴۸ء

حافظ ہی کے زمانے کا دَورِ قمر ہے آج
برپا جو ہر مقام پر اک شور و شر ہے آج

بویا گیا جو زہر یہاں ڈیڑھ سَو برس
ہر بس کی گانٹھ اک شجر بارور ہے آج

بغض و حسد کا باغ ترقی پذیر ہے
کل پُور بھر جو پیڑ تھا وہ ہاتھ بھر ہے آج

وہ اب کہاں فرشتۂ روحانیت جو تھا
انساں ہر ایک نفس کے زیر اثر ہے آج
نازک بہت ہے مسئلۂ زندگی صفیؔ
دنیا تمام کارگہِ شیشہ گر ہے آج

دَورِ ہشتم سنہ ۱۹۴۸ء

بلبل کے ترانے ہوں کہ حسنِ گلِ تر، ہیچ
دلکش سہی آرائشِ گلزار، مگر ہیچ
تخئیل نے دو عضو ہی کو کردیا غائب
وہ حسن ہی کیا جب ہو دہن ہیچ، کمر ہیچ
بیداریِ دل اور ہے بیداریِ چشم اور
جو کچھ تمھیں اس خواب میں آتا ہے نظر، ہیچ
کیا گوش زد اُن کے نہیں ہوتے مرے نالے
افسوس ابھی تک ہے دعاؤں میں اثر ہیچ
کام آئے وہاں جا کے وہ سامان کرو جمع
جو پاس ہے، یہ سب ہے صفیؔ زادِ سفر ہیچ

دَورِ چہارم سنہ ۱۹۰۷ء

ڈوبتے تاروں نے دِکھلائے اُدھر آثارِ صبح
بہہ چلے آنکھوں سے اشکِ حسرتِ بیمارِ صبح

اُن سے اُمیدِ وفائے وعدۂ دیدارِ صبح؟
یاد جن کو شام تک رہتا نہیں اقرارِ صبح

تازہ روئی دیکھ کر حُسنِ صباحت خیز کی
شبنمستانِ خجالت ہے رُخِ گلزارِ صبح

مرکزِ ساغر سے تا دورِ اُفق پھیلی وہ ضو
بن گیا جامِ صبوحی نقطۂ پرکارِ صبح

فرشِ گُل پر سونے والو اُٹھ کے خوابِ ناز سے
اک ذرا دیکھو بہارِ خندۂ سرشارِ صبح

اِس طرف جوشِ قدح وجہِ فروغِ حُسنِ شوخ
اُس طرف رنگِ شفق گلگونۂ رخسارِ صبح

اک بُتِ کافر نگہ یاد آگیا ہم کو صفیؔ
دیکھ کر دوشِ فلک پر رشتۂ زنّارِ صبح

دورِ ہشتم سنہ ۱۹۳۸ء

مریضِ عشق کبھی اس قدر نہ تھا گُستاخ
ہوئے تلاشِ اثر میں لبِ دعا گُستاخ

حضورِ حُسن ہے اے عشق یہ خلافِ ادب
کہ ہو زبان، دمِ عرضِ مدعا گُستاخ

حجابِ حسن ادب آموزِ عشق تھا پہلے
وفورِ نشہ میں خود ہوگئی حیا گُستاخ

زمانے بھر سے تو بیگانگی کا ہے برتاؤ
اداشناسوں سے ہے شوخیِ ادا گُستاخ

حریمِ ناز میں اُن تک یہ کیا پہونچ سکتا؟
صفیؔ نہ ہوتا اگر نالۂ رسا گستاخ

دورِ ہشتم ۱۹۴۸ء

منصبِ عشق مسلّم نہ رہا میرے بعد
دوش پر حسن کے ہے شالِ عزا میرے بعد

اثر اندوز ہو یارب یہ دعا میرے بعد
کہ جو اب ہے وہ بدل جائے فضا میرے بعد

یاد آؤں گا جفا کار دل آزاروں کو
عام ہو جائے گا جب قحطِ وفا میرے بعد

ہمصفیرانِ چمن یاد مجھے کر لینا
ہو موافق جو گلستاں کی ہوا میرے بعد

فکر میں اس کے مٹانے کی ہے اک جمِ غفیر
سخت دشوار ہے اردو کی بقا میرے بعد

خاص اردوے معلّے ہے صفی جس کا نام
یہ زباں اب نہ رہے گی بخدا میرے بعد

دورِ ہشتم ۱۹۴۸ء

غم ذائقے میں عیش سے ہے بیشتر لذیذ
گو تلخ مثلِ زہرِ ہلاہل، مگر لذیذ

ہر دردمندِ عشق ہے اس پر فریفتہ
خونِ جگر لذیذ ہے اور کس قدر لذیذ

لطفِ بہارِ حسن ہے ملزومۂ شباب
قبل از رسیدگی کے نہ ہوگا ثمر لذیذ

شیریں ہو یا کہ ہو نمکیں حسنِ دلپسند
بیشک صفی نمک بھی ہے مثلِ شکر لذیذ

دَورِ دوم ۱۸۹۰ء

جگہ پیدا دلوں میں کی بتوں نے بے وفا ہوکر
خدا کو بھی ہوئی یہ بات کب حاصل خدا ہوکر

یہ چشم فتنہ گر کے نیچی نظروں سے اشارے ہیں
رہے کیونکر نگاہِ شوخ پابندِ حیا ہوکر

دکھایا کیا اثر خونِ شہیدِ نازنے قاتل
ہوا ہاتھوں سے ظاہر شوخیِ رنگِ حنا ہوکر

دلالت کرتی ہے بے مایگی پر ہرزہ گفتاری
خبر دیتا ہے مجکو ظرفِ خالی پُر صدا ہوکر

نہ سُلجھی ایک بھی گُتھی ہزاروں ٹھوکریں کھائیں
رہے بیکار زندہ ناخنِ انگشتِ پا ہوکر

نظر حوروں پہ ہے اے زاہدِ مسجد نشیں تیری
ارے کمبخت یہ شاہد پرستی پارسا ہوکر

چلے جاؤ اسی جانب صفیؔ گر خلد جانا ہے
گیا ہے راستہ جنّت کو سیدھا کربلا ہوکر

دَورِ دوم ۱۸۹۰ء

ہنس پڑے قاتل الٰہی شکوۂ بیداد پر
فیصلہ ہو جائے محشر میں اسی روداد پر

ہنس رہا ہے نالہائے بلبلِ ناشاد پر
بار الٰہا باغ میں بجلی گرے صیاد پر

اپنے ہو جاتے ہیں بیگانے پریشانی کے وقت
ہنستے ہیں گل انتشارِ نکہتِ برباد پر

اصل منشائے بنائے دیر و کعبہ ایک ہے
پھر دوئی شیخ و برہمن میں ہے کس بنیاد پر

چھوڑ کر آدم گئے تھے کس قدر میراثِ غم
ہو رہی ہے آج تک تقسیم جو اولاد پر

وہ جفائیں سادگی سے تھا جنھیں بھولا ہوا
آگئیں سب یاد ظالم کو میری فریاد پر

ہم شکایت میں کسی کا نام تو لیتے نہیں
تم ستمگر ہو تو بگڑو شکوۂ بیداد پر

بے نیازِ تربیت ہو جب صفیؔ طبعِ سلیم
پھر تو شاگردی بھی اک احسان ہے استاد پر

دورِ سوم ۱۸۹۷ء

خدائی بھر کو اپنا کر لیا نا آشنا ہو کر
یہ بت اب اور کیا کرتے معاذ اللہ خدا ہو کر

دمِ آخر کسی کا ہچکیاں لینا یہ کہتا ہے
کچھ آہیں دل میں شاید رہ گئی تھیں نارسا ہو کر

خدا خو نگرمیِ عشاق اس بیگانہ خوئی پر
دغا داروں سے اچھے ہو کہیں تم بیوفا ہو کر

سوارِ کشتیِ طوفاں زدہ کے قلب سے پوچھو
خدا ہی یاد آتا ہے بلا میں مبتلا ہو کر

کسی کی جلوہ گاہِ ناز میں کیا جانے کیا دیکھا
صفی! دل رہ گیا آئینۂ حیرت نما ہو کر

سنہ ۱۸۹۷ء

جوشِ وحشت میں گیا گلشن بیاباں دیکھ کر
ہنس پڑیں کلیاں مرا چاکِ گریباں دیکھ کر

کالے کالے ابر قبلے کی طرف سے جب اٹھے
میں نے توبہ توڑ دی یہ ساز و ساماں دیکھ کر

کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا ہے نیرنگِ بہار
شبنم اشک افشاں ہے کیوں پھولوں کو خنداں دیکھ کر

آنکھوں میں پھر جاتی ہے تاریکیٔ کنجِ لحد
دل لرزتا ہے سوادِ شامِ ہجراں دیکھ کر

اب گریباں ہے نہ دامن ہے نہ دل ہی اپنے پاس
پھر صفی ہم کیا کریں جوشِ بہاراں دیکھ کر

دورِ پنجم سنہ ۱۹۱۲ء

دلِ حزیں کے موافق نہیں ہوائے بہار
خزاں رسیدہ چمن میں کہو نہ آئے بہار

دکھا رہی ہے جوانی کا جوش ارے توبہ
کئی مقام سے مسکی ہوئی قبائے بہار

ہنسا رہی ہے گلوں کو رُلا رہی ہے مجھے
نشاط خیز نسیمِ جنوں فزائے بہار
رہے گا دَور و تسلسل یہی زمانے میں
نہ انتہائے خزاں ہے نہ انتہائے بہار
قفس میں گو دلِ بیتاب کو بہت روکا
مگر زباں سے نکل ہی گیا کہ ہائے بہار
ہنسا سکے گا اُسے کیا کوئی زمانے میں
برنگِ ابرِ بہاری جسے رُلائے بہار
ہجومِ بیخودیِ عشق اے معاذاللہ
نہ آشنائے خزاں ہوں نہ آشنائے بہار
صفیؔ مزار ہمارا کسی چمن میں بنے
طوافِ قبر کو ہر سال تاکہ آئے بہار

سنہ ۱۳۱۹ء

اب جوانی کی اُمنگیں نہ وہ تاثیرِ بہار
دل ہے ٹوٹا سا اک آئینۂ تصویرِ بہار
مُنھ میں کف، ہاتھ میں سر، پاؤں میں زنجیرِ بہار
درِ زنداں پہ کھنچی یوں مری تصویرِ بہار
دل کو برمانے لگے نالۂ شبگیرِ بہار
کونلیں کوک اُٹھیں چلنے لگے تیرِ بہار
سبز ہے قصرِ محبت کا ہر اک آئینہ
دل میں تصویرِ بہار آنکھوں میں تصویرِ بہار

ورقِ شیب ہو چاہے ورقِ عہدِ شباب
ایک تصویرِ خزاں، ایک ہے تصویرِ بہار

تشنۂ ابرِ بہاری تھے خبر یہ کیا تھی
تنکے چُنوائے گی اک دن ہمیں تاثیرِ بہار

چاکِ دامن پہ خزاں میں جو رفو کرتا ہوں
ہنس رہی ہے مری تدبیر پہ تقدیرِ بہار

دل اُبھرتا ہی نہیں لاکھ اُبھارے کوئی
ہوں وہ افسردہ کہ چلتی نہیں تدبیرِ بہار

بجلیاں کوندتی رہتی ہیں برابر ہر سمت
ہوتی رہتی ہے اشاروں ہی میں تقریرِ بہار

دل اُلٹ جائے جو اُلٹو ورقِ سادۂ گُل
ذہن میں آئیں اگر معنیِ تحریرِ بہار

شوخیِ رنگِ حنا صاف کہے دیتی ہے
کہ مرے قبضۂ قدرت میں ہے تسخیرِ بہار

پھول دیوانہ سمجھ کر ہمیں ہنس دیتے ہیں
کس سے گلشن میں کریں شکوۂ تاخیرِ بہار

امتحاں گاہِ شہیدانِ محبت ہے چمن
شاخِ گُل ہے کہ چمکتی ہوئی شمشیرِ بہار

بیلیں گھبرا کے درختوں پہ چڑھی جاتی ہیں
جوشِ مستی میں نہیں کوئی عنانگیرِ بہار

دُہری زنجیروں میں جکڑے ہیں ترے دیوانے
ایک زنجیرِ جنوں، دوسری زنجیرِ بہار
دیکھ کر دشتِ جنوں پاؤں صفی پھول گئے
کیا قیامت ہے گرانبارِیِ زنجیرِ بہار

دورِ ششم ۱۹۲۹ء

ڈر ہے شکستِ رونقِ بازار دیکھ کر
بک جائیے نگاہِ خریدار دیکھ کر
کچھ ریزہ ہائے شیشۂ دل بھی ہیں فرشِ راہ
رکھیے قدم ذرا دمِ رفتار دیکھ کر
زنداں سے گھر پلٹ کے جب آئے بلا نصیب
آنسو ٹپک پڑے در و دیوار دیکھ کر
لو چرخ نے بھی کھینچ لیا اب ستم سے ہاتھ
اک فتنہ گر کو بے سبب آزار دیکھ کر
ڈر ہے مجھے کہ رشتۂ اُلفت نہ ٹوٹ جائے
تسبیح سے کشاکشِ زنار دیکھ کر
تھے لن ترانیوں سے مگر بے خبر کلیم
ہونا تھا ورنہ تشنۂ دیدار دیکھ کر
دیکھا صفی کہ وہ سر بالیں ہیں جلوہ گر
چونکا جو خوابِ طالعِ بیدار دیکھ کر

دورِ ہفتم ۱۹۳۱ء

تو پاؤں، جب سے، زاہد رکھتا نہیں زمیں پر
تیرا نشانِ سجدہ اک داغ ہے جبیں پر

چھائی ہے تیرگی سی زاہد تری جبیں پر
لَو دے رہا ہے میرا نقشِ قدم زمیں پر

جو کچھ گذر رہی ہے میرے دلِ حزیں پر
تفسیر ہے اُسی کی ایک اک شکن جبیں پر

وعدہ خلافیوں کی آخر ہے کوئی حد بھی
ہاں پر کروں بھروسہ یا آپ کی نہیں پر

روزِ ازل سے اب تک دلکش حسیں مرقع
زیرِ زمیں ہیں جتنے اُتنے نہیں زمیں پر

تیرے بھی جور اُٹھائیں اُن کے بھی نازِ بیجا
کُل ذمہ داریاں ہیں کیا اے فلک ہمیں پر

خاک آئے گا سمجھ میں رازِ طلسمِ ہستی
کھینچا کرو لکیریں بیٹھے ہوئے زمیں پر

مثلِ صفی اُسی پر میں بھی مِٹا ہوا ہوں
عالم فریفتہ ہے جس نقشِ دلنشیں پر

دورِ ہشتم ۱۹۴۸ء

اے دل کسی کو خیر، کسی کو ہے شر عزیز
کیا شئے تجھے عزیز ہے، اور کس قدر عزیز؟

حسبِ مذاق سب کی جداگانہ ہے پسند
ہو منصفانہ جب تو ہے نقد و نظر عزیز

حاصل ہے قرب اُنھیں کو یہ مانا مگر مجھے
بڑھ کر عزیز سے ہے کلامِ اثر عزیز

دل کو اگر ہیں داغ کی گلکاریاں پسند
مژگاں کو ہے تراوشِ خونِ جگر عزیز

اُس مملکت کا دید کے قابل ہے بندوبست
اہلِ ہنر ہوں خوار جہاں بے ہنر عزیز

تھے اور ہیں صفی مرے جتنے تلامذہ
نکلے وفا شعار سب اُن میں، مگر عزیز

دَورِ ہشتم ۱۹۴۴ء

جب سے ہے اک دلِ مایوس گرفتارِ قفس
جلوۂ صبحِ قفس بھی ہے شبِ تارِ قفس

خوش و ناخوش رہے منظر یہی دو پیشِ نظر
در و دیوارِ چمن یا در و دیوارِ قفس

تو نے اے مرغِ خوش آہنگ بڑھا دی قیمت
ورنہ یوں کوئی بھی ہوتا نہ خریدارِ قفس

سر وہ جس میں کہ سمائی ہو ہوائے صحرا
نہ سزاوارِ چمن ہے نہ سزاوارِ قفس

صفی آزادہ روی ہے مری پابندِ جنوں
نہ پرستارِ چمن ہوں نہ پرستارِ قفس

دورِ ہشتم ۱۹۴۸ء

جس دن تنِ خاکی سے ہوئی روح ہم آغوش
غربت میں ہوئی یادِ وطن دل سے فراموش

افسوس کہ اس عالمِ نیرنگ میں پھنس کر
ہم کون ہیں کیوں آئے ہیں یہ بھی نہ رہا ہوش

بیکار ہی اس عکارے میں عمر گنوا دی
جب ہو نہ سکے اپنے فرائض سے سبکدوش

پھر آئے کہاں سے سخن گرم زباں تک
دل بجھ کے جب اپنا صفتِ شمع ہے خاموش

ہے بخت رسا اُن کا صفی قابلِ صد رشک
ہوں لختِ جگر جن کے وفا کیش و ادب کوش

دورِ ہشتم ۱۹۴۸ء

ہے محفلِ عشرت میں ادھر رقص اُدھر رقص
ہر قطرۂ مے سے ہے عیاں مثلِ شرر رقص

ہر ذرہ ہے سرگرمِ تپش بزمِ جہاں میں
ہر وقت ہر سمت ہے تا حدِ نظر رقص

کس کی نگہِ ناز نے چھیڑا صفیؔ آکر
کرنے لگا ہر قطرۂ خونابِ جگر رقص

دورِ ہشتم ۱۹۴۸ء

تیز رفتار ہے یونہی دلِ بیمار کی نبض
جیسے سرگرمِ تپش برقِ شرربار کی نبض
ہوئی جنبش جو ذرا لگ گئی اشکوں کی جھڑی
مژۂ تر ہے مگر ابرِ گہربار کی نبض
ہر رگِ سنگ کہیں خون نہ دیدے فرہاد!
اک ذرا کھول سمجھ بوجھ کے کہسار کی نبض
رکھیے انگشتِ حنائی تو ابھر آئے ذرا
ڈوبنے ہی کو ہے اب آپ کے بیمار کی نبض
کون خالی ہے تعصب کی حرارت سے صفیؔ
دیکھتا رہتا ہوں میں سبحہ و زنار کی نبض

دورِ ہشتم ۱۹۴۸ء

جب آؤ گے دل دیں گے تمھیں نذر، یہ تھی شرط
تم نے وہ ابھی تک مگر ایفا ہی نہ کی شرط
اک جزوِ مؤخر ہے جزا، اُس پہ یہ اصرار
جو اُس پہ مقدم تھی وہ پوری نہ ہوئی شرط

جس شخص کا شیوہ ہے صفی وعدہ خلافی
فرمایئے پھر آپ نے کیوں اُس سے بدی شرط

دَورِ پنجم ۱۹۲۰ء

دَورِ ماہِ رمضاں چرب زبانِ واعظ
خوب ان روزوں میں چلتی ہے دُکانِ واعظ

ہوتی رہتی ہے مسائل میں عجب قطع و برید
دیکھنا چلتی ہے قینچی سی زبانِ واعظ

محکِ زہدِ ریائی نگہِ نقد و نظر
جُز صفی کوئی نہیں مرتبہ دانِ واعظ

دَورِ ششم ۱۹۲۸ء

اللہ رے جذبِ حُسنِ رخِ تابدارِ شمع
پروانے کھنچ کے آتے ہیں بہرِ نثارِ شمع

کیسی ہی کیوں نہ بزم ہو یکساں ہے ہر جگہ
سوز و گداز و گریۂ بے اختیارِ شمع

اک شب کی میہماں ہے اگر غور کیجئے
شب زندہ دار، ہستیِ ناپائدارِ شمع

پایا ہے درسِ رقتِ قلب اس سے مدتوں
کیونکر دلِ صفی نہ ہو منت گذارِ شمع

دَورِ ہشتم ۱۹۴۸ء

روشن رہے جہاں میں ترے نام کا چراغ
ساقی عطا ہمیں بھی ہو لبریز اک ایاغ
آشوب گاہِ زاغ و زغن ہے وہ مرز بوم
جو تھی کبھی ہمائے سعادت کا خانہ باغ
کچھ فرق ہی بہار و خزاں میں نہیں رہا
اس دَورِ انقلاب میں یکساں ہے باغ و راغ
حسنِ معاشرت سے جو ہر دل عزیز تھے
اُن یوسفانِ مصر کا ملتا نہیں سراغ
کتنے ہی کشتگانِ جفا الحذر صفی
جب سے ہوئے شہید، گھر اُن کے ہیں بے چراغ

دَورِ دوم ۱۸۸۹ء

کیا جنوں کے جوش میں جاؤں گلستاں کی طرف
گل ہنسیں گے دیکھ کر چاکِ گریباں کی طرف
دیکھے کون اُس انجمن میں مجھ پریشاں کی طرف
دوستوں کی ہے نظر اک دشمنِ جاں کی طرف
اپنی بے برگ و نوائی پر فقیروں کی نظر
اہلِ دولت کی نگاہیں ساز و ساماں کی طرف
باغباں نزدیک ہے کیا آمدِ فصلِ بہار؟
بے ارادہ ہاتھ جاتا ہے گریباں کی طرف

یوں بسر کی زندگی دیوانگانِ عشق نے
سر رہا زانو پہ رُخ دیوارِ زنداں کی طرف
وہ جو ہنس ہنس کے نمک پاشِ جراحت ہیں صفی
لختِ دل آتے ہیں بیتابانہ مژگاں کی طرف

دورِ ہشتم ۱۹۴۸ء

حُسنِ اخلاق سے بیگانہ ہے بیگانۂ عشق
طرفہ گنجینۂ اسرار ہے ویرانۂ عشق
دامِ صد حلقۂ ادیان و ملل سے آزاد
کس قدر دیکھئے ہشیار ہے دیوانۂ عشق
نہ ہو جس میں کہ صفی شائبۂ بوالہوسی
درحقیقت ہے حقیقی وہی پیمانۂ عشق

دورِ ہشتم ۱۹۴۷ء

غم میں دمسازِ محبت دلِ ناساز ہے ایک
دے جو آوازہ بر آوازہ وہ ہمراز ہے ایک
کس کو خونریز کہیں کس کو دل آویز کہیں
سر سے پا تک ہر ادا کا تری انداز ہے ایک
بزمِ کثرت سے ہے ہم آہنگِ نشیدِ وحدت
مختلف ساز سہی زمزمہ پرداز ہے ایک

دلِ پُرآبلہ ہو یا کہ حبابِ نازک
ٹوٹنے پر مگر ان دونوں کی آواز ہے ایک
دمِ آخر ہم اسیرانِ قفس کے دل میں
کچھ نہیں اور فقط حسرتِ پرواز ہے ایک
دل قدح نوش اُسی صہبائے سخن کا ہے صفیؔ
لکھنؤ میکدۂ حافظِ شیراز ہے ایک

سنہ ۱۹۴۸ء

کیا خبر کیا ہو دعاؤں میں اثر ہونے تک
دل میں اُس خانہ برانداز کے گھر ہونے تک
یہی عالم جو رہا رات بسر ہونے تک
زندہ رہنے کے نہیں ہم تو سحر ہونے تک
کیا رہے کیا نہ رہے کون بتا سکتا ہے
ہیئتِ نظمِ جہاں زیر و زبر ہونے تک
پرفشاں پھرتے رہے گِرد اگر پروانے
گُل نہ ہو جائے کہیں شمع سحر ہونے تک
اخترِ صبح بناگوش تھا بنتا اک دن
قسمتِ قطرۂ نیساں میں گُہر ہونے تک
خود مجھی پر نہ کہیں بے خبری ہو طاری
بے خبر کو مری حالت کی خبر ہونے تک
سر پٹکتے رہے زنداں میں اگر یوں وحشی
دم نکل جائے گا دیوار میں در ہونے تک

اپنے چہرے کا صفی گریۂ پیہم کے سبب
رنگ بدلا ہی کیا خونِ جگر ہونے تک

دورِ ہشتم سنہ ۱۹۴۷ء

لبریزِ حرارت ہے تنِ زار کی رگ رگ
سر گرمِ تپش عشق کے بیمار کی رگ رگ

آخر کو ہوئی نغمۂ منصور سے دیکھو
لبریزِ انا الحق رسن و دار کی رگ رگ

جب شوخ طبیعت ہے ادا شوخ، نظر شوخ
کس طرح نہ پھڑکے بُتِ عیار کی رگ رگ

کہہ دے یہ صفی کوئی مسیحا سے کہ جلد آ
دَم توڑ رہی ہے ترے بیمار کی رگ رگ

دورِ دوم سنہ ۱۸۸۲ء

دیکھنے میں حباب سا ہے دل
نازک اس سے بھی کچھ سوا ہے دل

گرمیاں شمع کیوں دکھاتی ہے
اُس کو جس کا بُجھا ہوا ہے دل

لے کے ساقی نے مثلِ شیشۂ مے
طاقِ نسیاں پہ رکھ دیا ہے دل

اپنے رونے پہ آپ ہنستا ہے
کیسا دیوانہ ہو گیا ہے دل

دیکھیے کہتے ہیں صفی، احباب
پڑھیے سُننے کو چاہتا ہے دل

دورِ ہشتم ۱۹۴۵ء

دل خانہ خراب کا عالم ہے وہی جو حباب کا عالم
دیکھ کر اُن کو اور ہی کچھ ہے نظرِ انتخاب کا عالم
کچھ ہمارا ہی دل سمجھتا ہے اُن کے لطف و عتاب کا عالم
دیکھ سکتا نہیں کوئی سایہ ہے یہ شرم و حجاب کا عالم
بحرِ ہستی کے ہر نظارے میں پائیے گا سراب کا عالم
موت کیا شئے ہے، عینِ بیداری زندگی کیا ہے خواب کا عالم
اللہ اللہ زورِ طبع صفی
شیب میں ہے شباب کا عالم

۱۹۴۵ء

وہ دست کش جفا سے نہ ہوں گے، وفا سے ہم
پھر کیوں کریں بتوں کی شکایت خدا سے ہم
موجِ خرامِ ناز کا اندازِ دلفریب
کر لیتے ہیں شناخت اسی نقشِ پا سے ہم
اک مُشتِ خاک اور پھر اس پر یہ حوصلہ
کرنے لگے ہیں اب تو بغاوت خدا سے ہم
اے انقلاب جلد بدل دے نظامِ دہر
تنگ آ گئے ہیں اب ستمِ ناروا سے ہم
دامن سے راہِ عشق میں آنے دیا نہ داغ
محتاط انتہا کے رہے ابتدا سے ہم

تا نغمۂ الست ہو پھر سامعہ نواز
لہریں صدا کی چھانٹ رہے ہیں فضا سے ہم
مانندِ کاہِ خشک بہر سو رواں دواں
محروم ہیں صفی کششِ کہربا سے ہم

سنہ ۱۹۴۸ء

وہ نقطہ جو تھا مرکزِ آدمیت بہت دُور اُس سے جُدا ہو گئے ہم
سوے میکدہ صحنِ مسجد سے اُٹھ کر جہاں ابر چھایا ہَوا ہو گئے ہم
شرابِ سخن سے بھی اب توبہ کر لی
صفی رند تھے پارسا ہو گئے ہم

دَورِ دوم سنہ ۱۸۸۲ء

کیوں یہ کہتے ہیں جو روٹھیں تو منا بھی نہ سکوں
نازِ ہے ہجر کا صدمہ کہ اُٹھا بھی نہ سکوں؟
مرضِ ہجر میں دشوار نہیں ضبطِ فغاں
راز کچھ زردیِ رُخ ہے کہ چھپا بھی نہ سکوں؟
بارِ خاطر ہوا کیوں بزم میں تیری اے دوست
کیا ملالِ دلِ دشمن ہوں کہ جا بھی نہ سکوں؟
اُس نے یہ کہہ کے مری شمعِ لحد گُل کر دی
کیا لگی ہے ترے دل کی کہ بُجھا بھی نہ سکوں؟
سخت نازک ہے صفی مرحلۂ ناز و نیاز
وہ رُلائیں مجھے میں اُن کو ہنسا بھی نہ سکوں؟

سنہ ۱۸۸۴ء

جی رہے ہیں انتظارِ وعدۂ دیدار میں
ورنہ کب کے مر گئے ہوتے فراقِ یار میں
کیا کریں سیرِ بلند و پستِ عالم گوشہ گیر
کون کھائے ٹھوکریں اِس راہِ ناہموار میں
کوہ و صحرا لے گئے جاگیر میں فرہاد و قیس
اب رہا کیا عشق کی اُجڑی ہوئی سرکار میں
ہم غریبوں کا خدا جانے وہاں کیا حشر ہو
کون پوچھے گا بھلا اتنے بڑے دربار میں
سوتے ہیں کیا بے خبر کنجِ لحد میں وہ صفیؔ
نیند آتی ہی نہ تھی جن کو مکانِ تار میں

سنہ ۱۸۸۵ء

راحت نصیب ہو کسی پہلو وہ ہم نہیں
دل سے جگر میں درد زیادہ ہے کم نہیں
اے شمع مثل میرے تجھے تابِ غم نہیں
دل جل رہا ہے دیکھ مگر آنکھ نم نہیں
چندے مسافرانہ ہے اپنا یہاں مقام
آنے کی کچھ خوشی نہیں جانے کا غم نہیں
ثابت ہوا فشارِ لحد سے یہ اے زمیں
تو بھی اُنھیں دباتی ہے جن میں کہ دم نہیں

کھلتی ہے اس کولے کے ہر اک دل کی کیفیت
کاسہ فقیر کا بھی کم از جامِ جم نہیں

کیا میکشی سے مجکو غرض، بہرِ بیخودی
کیفِ شرابِ عشقِ خرد سوز کم نہیں

پھر کیا سبب ہے جا کے جو آتا نہیں کوئی
دلچسپ اگر سوادِ دیارِ عدم نہیں

وہ رند ہیں جنھیں مے و معشوق ہے نصیب
وہ پارسا ہیں جن کو یہ ساماں بہم نہیں

ہے فصلِ برگ ریزِ سخن آج کل صفیؔ
ہنگامِ گل فشانیِ نخلِ قلم نہیں

۱۸۸۷ء

کھیل سمجھی تھیں تجلّی کا تماشا آنکھیں
تاب کیوں لا نہ سکیں حضرتِ موسیٰ آنکھیں

یہی موجوں کا اشارہ ہے، کہیں کیا دیکھا؟
ان حبابوں نے جو کھولیں لبِ دریا آنکھیں

آ گیا خوابِ اجل تو بھی نہ یہ بند ہوئیں
کس کے دیدار کی رکھتی ہیں تمنا آنکھیں

صافیِ باطن سے نہیں تیرہ دروں کو کچھ نفع
کبھی عینک سے نہ ہوں کور کی بینا آنکھیں

شرم سے، ناز سے، فتنے سے بھری متوالی
چشمِ بد دور ہیں اس شوخ کی کیا کیا آنکھیں

اللہ اللہ ہے کیا جوش پہ شوقِ دیدار
صورتِ آئنہ دل میں ہوئیں پیدا آنکھیں
کیسی ٹھنڈک ہے صفی گور کے تہ خانے میں
خود بخود بند ہوئی جاتی ہیں اِس جا آنکھیں

سنہ ۱۸۸۷ء

مآلِ عاشقِ شوریدہ سر کو دیکھتے ہیں
کبھی اُسے وہ کبھی سنگِ در کو دیکھتے ہیں
بتوں کا حسن خدا ساز دیکھنے والو
تم آئنے کو ہم آئینہ گر کو دیکھتے ہیں
ہے کچھ تو ناز اُنھیں اپنے زورِ بازو پر
جو ہنس کے خود مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
خرامِ ناز سے جو راہ گُل بداماں ہے
نیاز کیش اُسی رہگذر کو دیکھتے ہیں
صفی وہ خوب سمجھ لیں کہ ہے یہ آئینہ
مرے سخن میں جو عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

سنہ ۱۸۸۹ء

دل اُلجھا ہے زلفِ شکن در شکن میں
گنہگارِ اُلفت بندھا ہے رسن میں
حد وصف و قدم حسن کی سیر گاہیں
کبھی اِس چمن میں کبھی اُس چمن میں

اسیرِ قفس تجکو ہونا ہے بُلبُل
بناتی ہے کیوں آشیانہ چمن میں
جو قسمت میں جلنا ہی تھا شمع ہوتے
کہ پوچھے تو جاتے کسی انجمن میں
ہیں الفاظ آئینۂ حُسنِ معنی
صفی کیا صفائی ہے تیرے سخن میں

سنہ ۱۹۸۹ء

ناطاقتی ذریعۂ ترکِ ہوس نہیں
اے جوشِ طبع مانعِ سیلابِ خس نہیں
صیّاد کچھ تو میری طرف سے ہے بدگماں
بے وجہ رخنہ بندیِ چاکِ قفس نہیں
اے باغباں اُجاڑ نہ بُلبل کا آشیاں
کیا اور باغ بھر میں کہیں خار و خس نہیں
محفوظ کب خزاں سے ہے اے گُل بہارِ حُسن
جو رنگ اگلے سال تھا اکبے برس نہیں
نازک ہے دل کو گرم مزاجی کی کب ہے تاب
آئینے کو تحمّلِ بادِ نفس نہیں
صیّاد بے خبر ہے مبارک ہو عندلیب
دشوار بند و بستِ شکستہ قفس نہیں
اے آہ رخنہ خانۂ صیّاد میں بھی ہو
کافی فقط کشائشِ چاکِ قفس نہیں

ہو چاک دامنِ شبِ ہجراں کسی طرح
اتنا بھی صبحِ حشر تجھے دسترس نہیں
کیا کاروانِ نکہتِ گُل کا نشاں ملے
قاتل نہیں ہو تم کہ مسیحا نفس نہیں
بے کیف پھر سخن ہے اگر پختگی نہ ہو
سرمایۂ سُرورِ مئے نیمرس نہیں
یوں سب تھے چارہ سازِ دلِ دردمند کے
بیدادگر جو تم ہو کوئی دادرس نہیں
سُنتے ہیں قافلے میں سبھی نالۂ جرس
لیکن کوئی غریب کا فریادرس نہیں
احباب بھول کر بھی صفیؔ وہ کفن نہ دیں
جو شاہ کی ضریحِ مقدس سے مَس نہیں

سنہ ۱۸۹۰ء

بہار آئی چمن پھولوں کی خوشبو سے مہکتے ہیں
نواسنجانِ گلشن وجد میں کیا کیا چہکتے ہیں
کسی کی لغزشِ مستانہ پھر جاتی ہے آنکھوں میں
ہوائے شبنمی سے ساغرِ گُل جب چھلکتے ہیں
فلک تو ایک اپنے خوشۂ پروین پہ نازاں ہے
یہاں ایسے ہزاروں تاک میں خوشے لٹکتے ہیں
چلی پھر بادِ نوروزی مبارک بزم افروزی
چمن میں وردیاں بجتی ہیں یا غنچے چٹکتے ہیں

شہِ دیں قوتِ بازوئے احمد شیرِ یزدانی
کہ جس کا نام سن کر سرکشوں کے دل دھڑکتے ہیں

خوشامد خضر کی جا کر کریں ہم کیوں بیاباں ہیں
علیؑ ہو رہنما جن کا وہ رہرو کب بھٹکتے ہیں

صفی اس ناتوانی میں بھی ہم بھاری ہیں دشمن پر
برنگِ خار چشمِ ناتواں بیں ہیں کھٹکتے ہیں

سنہ ۱۸۹۰ء

رحمتِ حق ہے سوا یا مرے عصیاں، دیکھوں
جھونک کھاتا ہے کدھر پلۂ میزاں دیکھوں

جذبۂ شوقِ شہادت کا ہے دل میں کیا رنگ
اک ذرا کھینچ کے سینے سے تو پیکاں دیکھوں

شام ہی سے ہے صفی آج مری حالت غیر
نہیں امید کہ صبحِ شبِ ہجراں دیکھوں

سنہ ۱۸۹۰ء

خط بھیج کر دل اب ہے اسی پیچ و تاب میں
کیا جانے کیا لکھا ہو انھیں اضطراب میں

تر دامنی سے پاک ہوں بزمِ شراب میں
ہوتا ہے خشک جامۂ تر آفتاب میں

بر لائے گا وہی دلِ نازک کی خواہشیں
جس نے ہوا کو بند کیا ہے حباب میں

ساغر بکف ہے ساقیِ محفل وہ مہ جبیں
یا دورِ آفتاب شبِ ماہتاب میں
دیکھیں اگر بچشمِ تامل تو دمبدم
ہر جزوِ کائنات ہے ایک انقلاب میں
اُس شوخِ حیلہ جو سے وفا کا خیال خام
اک خواب ہے جو دیکھ رہا ہوں میں خواب میں
دُنیائے بے ثبات میں مانندِ موج و برق
گذری ہماری عمر صفیؔ پیچ و تاب میں

دورِ سوم ۱۸۹۱ء

جو ناممکن وہاں تک ہم رسائی دیکھ لیتے ہیں
درِ جاناں بہ شوقِ جبہہ سائی دیکھ لیتے ہیں
فدا کرتے ہیں نقدِ جان و دل ہم بھی حسینوں پر
مگر اس شرط سے جب پارسائی دیکھ لیتے ہیں
نظر نبضِ دلِ انساں ہے اس کے دیکھنے والے
ہر اک دل کی صفائی ناصفائی دیکھ لیتے ہیں
ہمارا دل بتوں کا رُخ تماشا گاہِ عالم ہے
اسی عینک سے ہم ساری خدائی دیکھ لیتے ہیں
صفیؔ کم فرصتی میں جب غزل کی فکر کرتے ہیں
فقط شعروں میں بندش کی صفائی دیکھ لیتے ہیں

۱۸۹۳ء

خس و خاشاک بن کر کیوں رہے ہم صحن گلشن میں
کسی کے کام ہی آتے جگہ پاتے جو گلخن میں

نکیرین اس جگہ بھی اب خلل انداز راحت ہیں
سمجھ کر ہم تو کنج عافیت آئے تھے مدفن میں

کہاں مرہم لگائے کس جگہ بخیہ کرے کوئی
جگر میں داغ ہیں لاکھوں ہزاروں زخم ہیں تن میں

ہمیشہ جوش وحشت نے ہماری سرپرستی کی
بڑھے سائے میں زنداں کے پلے صحرا کے دامن میں

میری اس کوشش بیجا پہ کیا کیا برق ہنستی ہے
صفی چن چن کے دانے جمع کرتا ہوں جو خرمن میں

۱۸۹۸ء

تار ہیں ساز شکستہ کے وہ دمساز نہیں
ہم نشیں ہو گئے جو اب ہم آواز نہیں

کس طرح یہ نہیں معلوم مگر کٹ گئی عمر
داستاں کا مری انجام ہے آغاز نہیں

حسن کے واسطے ہیں شوخ ادائیں لازم
ورنہ بے رنگ ہے جب نقش ہیں پرداز نہیں

اب رہائی کی خوشی ہے نہ اسیری کا ملال
جانتا ہوں کہ مجھے طاقت پرواز نہیں

دل خراش اس قدر انداز نوازش کب تھا
کیوں مجھے چھیڑتے ہیں غیر سے گر ساز نہیں
جامۂ حسن یہ جس رنگ کا چاہے پہنے
گل ہیں وہ طرزِ ادا وہ روشِ ناز نہیں
ترکِ دنیا پئے عقبیٰ جو ہے اک حسنِ طلب
بے نیازی پہ صفیؔ اپنی ہمیں ناز نہیں

۱۸۹۹ء

داغ دل میں رہ گئے آہیں پریشاں ہو گئیں
یہ نشاں اُن بستیوں کے ہیں جو ویراں ہو گئیں
دَور بدلا چند تصویریں نمایاں ہو گئیں
مشکلیں وہ مشکلیں کیسی جو آساں ہو گئیں
کیسی کیسی صورتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں
سامنے آنکھوں کے آئیں اور پنہاں ہو گئیں
ہوں اسیرِ کُنجِ تنہائی نہ پوچھو سرگذشت
سختیوں نے اس طرح گھیرا کہ زنداں ہو گئیں
وقتِ پیری کب جوانی کی اُمنگیں چھُپ سکیں
جھُرّیاں بن کر وہی رُخ سے نمایاں ہو گئیں
بند کرلیں جب تصوّر حسنِ دلکش کا بندھا
دونوں آنکھیں حضرتِ یوسفؑ کا زنداں ہو گئیں
کب گئیں بیکار تیغِ ناز کی خوں ریزیاں
باعثِ گلکاریِ خاکِ شہیداں ہو گئیں

حُسن اُس کا ہے شباب اُس کا ادائیں اُس کی ہیں
لاکھ جانیں جس کی اک چتون پہ قرباں ہوگئیں

حشر تک سوئے صفیؔ ہم قبر جنبش میں رہی
قلب کی بے تابیاں گہوارہ جنباں ہوگئیں

سنہ ۱۹۰۰ء

وہ آئیں تیغ بکف عذر امتحاں میں نہیں
لہو کی بوند مگر جسم ناتواں میں نہیں

سُنیں تو دل پہ لگے چوٹ سُننے والوں کے
یہ کیوں کہوں کہ اثر کچھ مری فغاں میں نہیں

کیا ہے کچھ تو سمجھ کر یہاں کسی نے قیام
وہ کنجِ دل میں فضا ہے جو لامکاں میں نہیں

کیا ہے وعدہ کسی بے وفا نے آنے کا
وگرنہ عذر ہمیں مرگِ ناگہاں میں نہیں

فنا کے بعد کوئی ربط جسم و جاں میں نہیں
مکاں ہے صاحبِ خانہ مگر مکاں میں نہیں

گرے جو برق تو کیا غم قفس نشینوں کو
کہ خار و خس کے سوا کچھ بھی آشیاں میں نہیں

صفیؔ ترا وِش خونابۂ جگر کب تک
لہو کی بوند بھی اب جسمِ ناتواں میں نہیں

سنہ ۱۹۰۰ء

کیا پوچھتے ہو درد کہاں ہے کہاں نہیں
رکھا ہے تم نے ہاتھ جہاں پر وہاں نہیں
پھرتی ہے شکل سامنے جب آنکھ بند کی
اب میرے اُن کے پائے نظر درمیاں نہیں

سنہ ۱۹۰۰ء

پرسشِ ظرفِ قدح خوار ہے میخانے میں
ساقیِ بزم نے خط کھینچے ہیں پیمانے میں
ظلمتِ قبر سے کیا بعدِ فنا گھبرانا
عمر بھر ساتھ رہی ہے جو سیہ خانے میں
عالمِ نزع میں کہتی ہے یہی روحِ صفیؔ
ان کو آنے میں تکلف ہے مجھے جانے میں

دَورِ چہارم سنہ ۱۹۰۱ء

بے اذنِ غیر رکھ نہیں سکتا جو سر کو میں
حسرت سے دیکھتا ہوں کسی سنگِ در کو میں
عہدِ شباب اور بھی کچھ دنوں قیام
آخر تو ہوں گا تجھ سے جدا عمر بھر کو میں
کچھ اس میں بھید ہے جو دعا مانگتا نہیں
کیوں دل کا راز دار بناؤں اثر کو میں

درماں طلب ہوں کیوں مرضِ لاعلاج کا
بدنام کیا سمجھ کے کروں چارہ گر کو میں

پرسانِ حال کون ہے اے بیخودی مرا
جاتا ہوں خیر آپ ہی اپنی خبر کو میں

رکھا کہیں کا مجکو نہ رشکِ رقیب نے
اے کاش چھوڑتا نہ ترے رہگذر کو میں

گم کردہ راہ دل کی چلا ہوں خبر کو آج
اس بیخودیِ شوق میں جاؤں کدھر کو میں

اعجازِ دلفریبیِ نظارہ دیکھنا
ہستی سمجھ رہا ہوں طلسمِ نظر کو میں

آئینہ وار کچھ نہیں اپنی خبر مجھے
دکھلا رہا ہوں غیر کے عیب و ہنر کو میں

سنہ ۱۹۰۱ء

پھر دن بہارِ لالۂ خونیں کفن کے ہیں
آثار، جوشِ خونِ سرِ کوہکن کے ہیں

آزادِ عیش و غم کو نہ چھیڑ اے ہوائے دہر
شمعِ مزار ہم نہ چراغ انجمن کے ہیں

دیتا ہے آسماں نئی ہر روز گردشیں
خمیازہ کش جو دَورِ شرابِ کہن کے ہیں

خاموش ہیں ہوائے مخالف کو دیکھ کر
روشن دلی سے ورنہ چراغ انجمن کے ہیں

یوں داستانِ غم تجھے صیاد کیا سنائیں
ہم منتظر قفس میں نسیمِ چمن کے ہیں
کیونکر نہ دل جگر کا مصیبت میں ساتھ دے
دونوں غریب ایک جگہ اک وطن کے ہیں
اللہ رے ملالِ رقابت کہ ہم صفیؔ
طاعت گذار بُت کے عدو برہمن کے ہیں

۱۹۰۵ء

ہم اپنا حال کچھ اس طرح مایوسانہ کہتے ہیں
کہ وہ تک سُن کے روتے ہیں جنھیں بیگانہ کہتے ہیں
عروجِ حرمتِ مے اب کوئی دیکھے کہ واعظ تک
سرِ منبر حدیثِ شیشہ و پیمانہ کہتے ہیں
نقوشِ کفر و ایماں صفحہ ہستی کو یکساں ہیں
یہیں مسجد کبھی تھی اب جسے بُت خانہ کہتے ہیں
ہماری بھی جوانی تھی کبھی ہم بھی تھے رندوں میں
بڑھاپے میں دلِ مُردہ کا اب افسانہ کہتے ہیں
صفیؔ رندوں کو اِس کا بند ہو جانا قیامت ہے
درِ توبہ ہے وہ جس کو درِ میخانہ کہتے ہیں

۱۹۰۶ء

کون سی شئے ہے جو ڈھونڈھے سے کہیں ملتی نہیں
دلِ غریب اُس کی خبر تک ہمنشیں ملتی نہیں

خستگانِ عشق کو خلد و سقر دونوں ہیں ایک
قلب کو راحت جو سچ پوچھو کہیں ملتی نہیں

فرشِ گُل پر چلنے والوں کے قدم چھونا کجا
گرد آنکھوں میں لگانے کو کہیں ملتی نہیں

دل سے دل کو راہ آخر ہو تو کیونکر ہو بتاؤ
تم جو ملتے ہو، نگاہ شرمگیں ملتی نہیں

سعیِ لا حاصل سے آخر کیا نتیجہ ہے صفیؔ
بے مقدر دولتِ دُنیا و دیں ملتی نہیں

سنہ ۱۹۰۷ء

مرتا ہوں جن پہ ان کو سروکار بھی نہیں
یعنی دماغِ پُرسشِ بیمار بھی نہیں

طرزِ بیانِ عشق ہے کیا سہلِ ممتنع
دشوار بھی ہے پھر کوئی دشوار بھی نہیں

بیدادگر کے دل میں کچھ ایسی سماگئی
گنجائشِ تلافیِ آزار بھی نہیں

اللہ رے سادگی مرے قصرِ اُمید کی
نقش و نگارِ وہم غلط کار بھی نہیں

کیونکر کہوں ستم سے اُٹھایا نہ جائے گا
نازک وہ ہاتھ جس میں کہ تلوار بھی نہیں

پھر بھی فضائے دشتِ جنوں خوش سواد ہے
مانا کہ گھر میں اب در و دیوار بھی نہیں

اپنا صفیؔ میں آپ ہی بالیں پرست ہوں
سر زیرِ بارِ منّتِ غمخوار بھی نہیں

۱۹۰۸ء

ضو جو دھندلی سی شبِ ہجر ہے ان تاروں میں
جان اتنی بھی نہیں ہجر کے بیماروں میں

سوئے مقتل کوئی شمشیر بکف آتا ہے
عید ہے عید محبت کے گنہگاروں میں

ہے ہر اک رنگ میں شاطر دلِ وارستہ مزاج
مست مستوں میں تو ہشیار ہے ہشیاروں میں

کستے ہیں خوب اسیرانِ کہن آوازے
ہیں جو سرگوشیاں کچھ تازہ گرفتاروں میں

دے سکیں ساتھ صفیؔ کا دمِ پیمانہ کشی
اس قدر ظرف کہاں آپ کے میخواروں میں

۱۹۰۸ء

محشر طراز نالے کس کی زبان پر ہیں
گنتی کے چند تارے آج آسمان پر ہیں

زیرِ زمیں اُنھیں بھی رہنا ہے تا قیامت
جن کے دماغ نخوت آج آسمان پر ہیں

شکوے جو آپ گننے بیٹھے ہیں اب تو سُنیے
ہیں اُس سے بڑھ کے دل میں جتنے زبان پر ہیں

سرمہ لگا رہے ہیں اب دیکھنا نگاہیں
جن پر گلے کٹیں گے تیغیں وہ سان پر ہیں

تیغِ زباں سنبھالو، جوہر صفی دکھا دو
چاروں طرف سے حملے اُردو زبان پر ہیں

سنہ ۱۹۱۱ء

تپِ غم سے کسی پہلو نہیں راحت مقدر میں
جدھر کروٹ بدلیے آگ لگ جاتی ہے بستر میں

ہوائے وادیِ غربت بھری ہے کاسئہ سر میں
کروں گا ختم دورہ زندگی کا ایک چکر میں

ہے اک بجلی کی رَو ہر دھار خونِ گرم بسمل کی
کہ شہ رگ سے نکل کر جذب ہو جاتی ہے خنجر میں

پیالہ کیوں لیے لیتے ہو مجھ رندِ قدح کش سے
ٹھہر جاؤ ذرا سی دُرد ابھی باقی ہے ساغر میں

نگاہِ مستِ ساقی سے رگوں میں بجلیاں دوڑیں
بلا کی کیفیت ہے اِس شرابِ روح پرور میں

ستمگر خون کا دعویٰ تو کچھ مشکل نہ تھا لیکن
یہ ڈرتا ہوں کہ تجھ پر انگلیاں اُٹھیں گی محشر میں

مآلِ زندگی یہ تھا کہ سُن کر واقعہ میرا
رہا کچھ دیر سناٹا سا ایوانِ ستمگر میں

صفی ٹوٹی ہوئی ہر قبر یہ ہنس ہنس کے کہتی ہے
کہ رہنا ہے قیامت تک اِسی اُجڑے ہوئے گھر میں

دورِ پنجم ۱۹۱۱ء

کون یارب کشتۂ بے مہریٔ قاتل نہیں
رشک سے بسمل ہے وہ جو تیغ سے بسمل نہیں

درسِ عبرت ہوگی آیندہ یہ اوروں کے لئے
سعیٔ لاحاصل ہماری سعیٔ لاحاصل نہیں

سازِ ہستی پُرصدا یونہی رہے گا حشر تک
جس میں ہنگامہ نہ ہو ایسی کوئی محفل نہیں

زندگی میں مشکلوں کا جھیلنا دشوار ہے
تنگ آکر جان دے دینا کوئی مشکل نہیں

ایسے پھولوں میں بھی اُن بن ہے صفیؔ جنمیں کوئی
اختلافِ خال و خط، تفریقِ آب و گِل نہیں

۱۹۱۵ء

ملتفت بھی ہیں تو عرضِ مُدّعا کیونکر کریں
سوچتے ہیں دل میں آخر ابتدا کیونکر کریں

کچھ سمجھ کر وہ نہیں دیتے سوالوں کا جواب
سچ تو یہ ہے وعدۂ صبر آزما کیونکر کریں

شمع لے کر ہاتھ میں در تک انھیں پہونچا گئے
سوختہ دل اور شرحِ ماجرا کیونکر کریں

آپ نے وعدہ کیا ہے آپ ہی فرمایئے
اس کو میری زندگی کے دن وفا کیونکر کریں

جامۂ انسانیت میں جو فرشتہ ہیں صفیؔ
وہ بسر دُنیا میں بے آب و غذا کیونکر کریں

سنہ ۱۹۱۶ء

پوچھنا چھیڑ کے بیداد کسے کہتے ہیں
اب ستم او ستم ایجاد کسے کہتے ہیں

دیکھنا ضبط ترے ناز اُٹھانے والے
اُف بھی کرتے نہیں فریاد کسے کہتے ہیں

تو بھی سمجھا کبھی اِس لفظ کے معنی کمبخت
شادمانی دلِ ناشاد کسے کہتے ہیں

کیا خبر اُن کو جو ہیں صحنِ چمن میں آزاد
قفس و خانۂ صیاد کسے کہتے ہیں

صفیؔ اِس عہد میں جس کے ہوں بہت سے شاگرد
وہی استاد ہے اُستاد کسے کہتے ہیں

سنہ ۱۹۱۷ء

مٹ کر بھی یادگارِ دلِ داغدار ہوں
اپنے خزاں رسیدہ چمن کی بہار ہوں

ہے جوہروں پہ گرد کی چادر پڑی ہوئی
بزمِ جہاں میں آئینۂ پُرغبار ہوں

پیری کو میری، عہدِ جوانی پہ بھی ہے ناز
یعنی گذشتہ عمر کی اک یادگار ہوں

جس سے کبھی تھی گرمیٔ ہنگامۂ نشاط
کہتا ہے اب وہ دل کہ چراغِ مزار ہوں

کہتی ہے مجھ سے ہنس کے صفیؔ عمرِ بے ثبات
ناپائدار جلوۂ برق و شرار ہوں

سنہ ۱۹۱۷ء

نہ مٹنے ہی کے لائق ہوں نہ رہنے ہی کے قابل ہوں
طرازِ آفرینش حق نما اک نقشِ باطل ہوں
جہاں برہم ہوئے اجزا فراہم ہو نہیں سکتے
سمجھ لو سینۂ ہستی میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں
میرے دم تک یہ ساری روشنی ہے بزمِ ہستی میں
فروغِ شعلۂ ادراک سے اک شمعِ محفل ہوں
حیات و موت میں پیدا کیا ہے رابطہ میں نے
انھیں دو دائروں کے درمیاں اک حدِ فاصل ہوں
صفیؔ جب خودکشی کی ہے تو مانگوں خوں بہا کس سے
سمجھ لو کشتۂ عبرت ہوں اپنا آپ قاتل ہوں

سنہ ۱۹۱۷ء

اسیرِ پنجۂ جوشِ جنونِ فتنہ ساماں ہوں
اگر دامن ہوں یوسفؑ کا زلیخا کا گریباں ہوں
فروغِ ہستیٔ موہوم کا اپنے تماشائی
سراپا اک دلِ پُر داغ ہوں سروِ چراغاں ہوں
مگر پائی ہے تعلیمِ فنا کثرت میں وحدت سے؟
جو مجھ پر پرتوِ خورشید ہے وہ شبنمستاں ہوں
وہ آہِ سرد ہوں نکلے جو اک ٹوٹے ہوئے دل سے
سراپا درد ہوں اور درد کا خود اپنے درماں ہوں

مرے سینہ میں سب کچھ ہے مگر جویندہ یابندہ
دبستانِ معارف ہیں کتابِ طاقِ نسیاں ہوں

چراغِ دیر و کعبہ کی تجلی کا ہوں پروانہ
خبر یہ بھی نہیں کافر ہوں ابتک یا مسلماں ہوں

میں سب کچھ ہوں مگر کچھ بھی نہیں المختصر سُنئے
صفی یہ فخر کیا کم ہے غلامِ شاہِ مرداں ہوں

۱۹۱۸ء

سخت جاں مجھ سا بھی زیرِ آسماں کوئی نہیں
ہو چکے سب ختم، باقی امتحاں کوئی نہیں

آہ کس بیکس کی یہ میت اُٹھی ہے جس کے ساتھ
نالہ کش کوئی نہیں ہے نوحہ خواں کوئی نہیں

بچے وہی جو چار تنکے آندھیوں میں اُڑ گئے
اے اسیرانِ قفس کا آشیاں کوئی نہیں

فتنہ گر چتون کی معنی خیز خاموشی ستم
ہر ادا میں سَو زبانیں پھر زباں کوئی نہیں

بے حجابانہ اُٹھا کر دل کا ہر پردہ صفی
بے تکلف وہ چلے آئیں یہاں کوئی نہیں

۱۹۱۸ء

پردۂ لطف میں اندازِ ستم دیکھتے ہیں
دیکھ سکتے نہیں جو غیر وہ ہم دیکھتے ہیں

کسی محفل سے اٹھائے گئے اُٹھے تھے جس کا
آج پھر ہم وہی سامان بہم دیکھتے ہیں
قافلے والوں کی آواز بھی آتی نہیں اب
کیا کریں بیٹھے ہوئے نقشِ قدم دیکھتے ہیں
اُٹھیئے بھی، منزلِ ہستی میں بہت بیٹھ چکے
دیر سے راہ صفیؔ! اہلِ عدم دیکھتے ہیں

۱۹۱۹ء

طالبِ دید پر آنچ آئے یہ منظور نہیں
دل میں ہے ورنہ وہ بجلی جو سرِ طور نہیں
اس سے بڑھ کر کوئی دل صاحبِ مقدور نہیں
غم سے مغموم، مسرت سے جو مسرور نہیں
ہم کو پروانہ و بلبل کی رقابت سے غرض؟
گُل میں وہ رنگ نہیں شمع میں وہ نور نہیں
ذوقِ پابندِ وفا کیوں رہے محرومِ جفا
عشق مجبور سہی حُسن تو مجبور نہیں
تابشِ حُسن نے جب ڈال دیے ہوں پردے
ممکن آنکھوں سے علاجِ دلِ رنجور نہیں
چھیڑ دے سازِ اناالحق جو دوبارہ سرِ دار
بزمِ رنداں میں اب ایسا کوئی منصور نہیں
کبھی کیسے ہو صفیؔ؟ پوچھ تو لیتا کوئی
دل دہی کا مگر اس عہد میں دستور نہیں

سنہ ۱۹۲۰ء

دردِ آغازِ محبت کا جب انجام نہیں
زندگی کیا ہے اگر موت کا پیغام نہیں

ہے تنزل کہ زمانے نے ترقی کی ہے
کفر وہ کفر اب اسلام وہ اسلام نہیں

نارسیدہ ہے ترا میوۂ جنت زاہد
پختہ مغزوں کو تلاشِ ثمرِ خام نہیں

یہی جنت ہے جو حاصل ہو سکونِ خاطر
اور دوزخ یہی دنیا اگر آرام نہیں

شعرگوئی کے لئے بس وہی موزوں ہے صفیؔ
جس کو جز شعر و سخن اور کوئی کام نہیں

دورِ ششم سنہ ۱۹۲۴ء

ہستی کو حباب جانتا ہوں
اک نقش بر آب جانتا ہوں

اللہ رے زورِ ہمتِ دل
پیری کو شباب جانتا ہوں

ہنگامِ خمارِ فاقہ مستی
پانی کو شراب جانتا ہوں

یاد عہدِ شباب تجکو
بھولا ہوا خواب جانتا ہوں

آئے گا نہ راہ پر کبھی دل
ہے خانہ خراب جانتا ہوں

کھلتے ہوئے پھول کو دمِ صبح
تصویرِ شباب جانتا ہوں

تجکو اے موت زندگی کے
ہمراہ رکاب جانتا ہوں

اُس بحرِ کرم کا دو جہاں کو
اک قطرۂ آب جانتا ہوں

دُنیا! تیری چمک دمک کو اک موجِ سراب جانتا ہوں
بیداریِ قوم کو صفیؔ میں
منجملۂ خواب جانتا ہوں

۱۹۲۴ء

جوانی یاد کر کے آنکھ میں آنسو بھر آتے ہیں
طلوعِ صبحِ پیری ہے ستارے جھلملاتے ہیں
نگارِ شوخ! اے عہدِ جوانی، بیوفا، ظالم
زرا تو بھی تو سُن تیرا ہی افسانہ سُناتے ہیں
مری عمرِ گریزاں پیروِ یارانِ رفتہ ہے
شباب آتا ہے پھر کر اب نہ وہ احباب آتے ہیں
چراغِ صبحگاہی سے فروغِ بزم مشکل ہے
کنول وہ اور ہیں جو رونقِ محفل بڑھاتے ہیں
سلوکِ دوست اور دشمن میں کوئی امتیاز آخر
فلک جس کو ستائے آپ کیوں اس کو ستاتے ہیں
نہ دانہ خاک میں ملتا نہ پاتا اوجِ سرسبزی
اُبھرتے ہیں وہی اک دن جو اپنے کو مٹاتے ہیں
نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے مرے آثارِ ہستی کو
بہت کچھ مٹ چکے باقی ہیں جو کچھ مٹتے جاتے ہیں
درِ مسجد پہ چلنے دو صفیؔ شیخ و برہمن کو
خدا کا نام لے کر ہم تو بت خانے کو جاتے ہیں

۱۹۲۵ء

سب کچھ ہے تیرے قبضۂ قدرت میں کیا نہیں
شانِ خدا ہے حُسن اگر تو خدا نہیں

اے حُسن اے مجسمۂ رحمتِ خدا
کافر ہے وہ جسے کہ ترا آسرا نہیں

آئینۂ صفاتِ جمالی ہے تیری ذات
محفل میں تو ہی تو ہے کوئی دوسرا نہیں

ہے اختلافِ وحدت و کثرت نمائشی
دریا سے موج، موج سے دریا جدا نہیں

جو تیرے دست بوس ہیں ان کی نگاہ میں
رنگینئ کفِ کلیم کا نقشِ حنا نہیں

لعلِ لبِ مسیح کی معجز نمائیاں
سب کچھ سہی، ہمارے مرض کی دوا نہیں

کھاتا ہوں چاک دامنِ یوسفؑ کی میں قسم
تیری قبا سے گُل کی قبا خوشنما نہیں

روشن کئے وہ نقشِ قدم نے ترے چراغ
اب راستہ خضر سے کوئی پوچھتا نہیں

گلگونۂ تیرا خونِ شہیدانِ کربلا
جُز تیرے کوئی قدر شناسِ وفا نہیں

کیونکر جچے تری نگہِ انتخاب میں
وہ دل مذاقِ درد سے جو آشنا نہیں

یاقوت کا وہ قصرِ ارم اور شہیدِ ناز
یہ اک لہو کی بوند کا بھی خوں بہا نہیں
جو دل کہ معتقد نہ ہوا اعجازِ حُسن کا
دُنیا میں ان سے کوئی زیادہ بُرا نہیں
یہ بے قرار وہ غلط انداز دیکھنا
دل کی خطا نہیں کہ نظر کی خطا نہیں
حُسنِ مجاز چشمِ حقیقت پسند میں
خوش رنگ ہے ضرور مگر دیرپا نہیں
تا لامکاں ہے دائرہ حُسن میں صفیؔ
اس کے حدود ملک کی کچھ انتہا نہیں

۱۹۲۵ء

کچھ بھی نہ حیف کرسکے ہستیٔ مستعار میں
ہوگئی ختم زندگی موت کے انتظار میں
حُسن کی جامہ زیبیاں، وضع کی دلفریبیاں
عشق کی ناشکیبیاں دشت میں لالہ زار میں
وعدہ خلافیوں کا عیب دامنِ حُسن پہ ہے داغ
فرق حضور آنہ جائے وضع کے اعتبار میں
گُل میں کہاں یہ رنگ و بو غنچے میں کب یہ گفتگو
بات جو آپڑے کہوں ایک نہیں ہزار میں
بھولے ہوئے زہے نصیب اب بھی جو یاد آگئے
فاتحہ کو کب آئے جب خاک نہیں مزار میں

پھر گئیں پتلیاں اگر ان کے مریضِ ہجر کی
کہیئے تو کیا خلل پڑا گردشِ روزگار میں

ظرف ہیں مختلف صفی کیفِ شراب ایک ہے
جام سفال میں ہو، یا ساغرِ زرنگار میں

۱۹۲۶ء

کوندتے ہی برق کے بیکار آنکھیں ہوگئیں
اب تو کیوں اے طالبِ دیدار آنکھیں ہوگئیں

اک فریبِ حسن کس کس رنگ سے ظاہر ہوا
لب مسیحا بن گئے بیمار آنکھیں ہوگئیں

بہرِ نازش لذتِ حسنِ تکلم کم نہ تھی
شامت آئی طالبِ دیدار آنکھیں ہوگئیں

دیکھ کر کافر نگاہیں چونک پڑتا ہوں صفی
خواب میں بھی فتنۂ بیدار آنکھیں ہوگئیں

۱۹۲۶ء

مزہ تو یہ ہے کوئی بھی قصوروار نہیں
تمھیں نظر پہ مجھے دل پہ اختیار نہیں

ہوئی ہے خلقتِ انساں میں طرفہ حکمت صرف
سب اختیار ہے پھر کچھ بھی اختیار نہیں

ستم ہے وعدے کا شرمندۂ وفا ہونا
جو لطف چاشنئ طولِ انتظار نہیں

دل آسماں سے مرے دل سے آسماں شاکی
کہ جب سے خلق ہوئے ہیں ہمیں قرار نہیں
تمھارا وعدۂ فردا غلط نہ ہو لیکن
فریب خوردہ زمانے کو اعتبار نہیں
ابھی تو جامِ صبوحی دیا ہے پیری نے
طلوعِ نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں
صفیؔ کہاں وہ جوانی کا جوش پیری میں
خزاں کا دَور ہے اب موسمِ بہار نہیں

۱۹۲۸ء

کوئی آباد منزل ہم جو ویراں دیکھ لیتے ہیں
بہ حسرت سوئے چرخِ فتنہ ساماں دیکھ لیتے ہیں
شبِ وعدہ ہمیشہ سے یہی معمول ہے اپنا
سحر تک راہِ شوخِ سست پیماں دیکھ لیتے ہیں
خدا نے دی ہیں جن روشن دلوں کو دُوربیں نظریں
سوادِ کفر میں بھی نورِ ایماں دیکھ لیتے ہیں
ٹپک پڑتے ہیں شبنم کی طرح بے اختیار آنسو
چمن میں جب کبھی گلہائے خنداں دیکھ لیتے ہیں
صفیؔ رہتے ہیں جان و دل فدا کرنے پر آمادہ
مگر اُس وقت جب انساں کو انساں دیکھ لیتے ہیں

سنہ ۱۹۲۹ء

کچھ نہ تھا اور وعظ کے سلسلۂ دراز میں
نہرِ شراب موجزن جنتِ خانہ ساز میں

سنگِ درِ حبیب کے جذب کی کوئی حد نہیں
پھر نہ اُٹھا جو سر جھکا سجدہ گہِ نیاز میں

ہجرِ وطن ہے اک عذاب کیوں نہ تڑپ کے جان دے
صیدِ حقیقت آشنا دامگہِ مجاز میں

عشق ترے طفیل میں ہو گئے روشناسِ خلق
آ گئے قیس و کوہکن حلقۂ امتیاز میں

پی لیا آبِ زندگی آپ نے کیوں جنابِ خضر
قیدِ حیات اُلجھ گئی سلسلۂ دراز میں

ایسے محل پہ دوستو! رخنہ گری ہے خودکشی
ہم بھی اُسی جہاز میں تم بھی اُسی جہاز میں

مستِ صبوحیٔ الست تھے جو صفیؔ بہک گئے
گردشِ شراب دیکھ کر نرگسِ نیمباز میں

دورِ ہفتم سنہ ۱۹۳۱ء

دنیا کا ورق بینشِ اربابِ نظر میں
اک تاش کا پتّا ہے کفِ شعبدہ گر میں

کچھ بھی نہیں جز پردۂ نیرنگِ تخیل
آغازِ جہاں دیدۂ انجام نگر میں

ہنگامِ ازل مجکو جو ساقی نے دیا تھا
اُس جام کا ہے کیف ابھی تک مرے سر میں
کرتی ہے گریبانِ سحر کو شفق آلود
ڈوبی ہوئی اک آہِ رسا رنگِ اثر میں
دن رات رواں کشتیِ عمرِ گذراں ہے
دنیا کی اقامت بھی گذرتی ہے سفر میں
کس دیدۂ گریاں نے لُٹائے تھے یہ موتی
ٹانکے ہیں جو شبنم نے گریبانِ سحر میں
پابند نہیں جلوۂ آزاد مکاں کا
یکساں ہیں صفیؔ دیر و حرم اپنی نظر میں

۱۹۳۳ء

غزل مسلسل شامِ تنہائی

قبر کی ظلمت شبِ فرقت کدھر چھائی نہیں
لاکھ چاہا نیند آ جائے مگر آئی نہیں
آسرا اک شمع کا تھا وہ بھی آخر جل بجھی
اب تو کوئی بھی انیسِ شامِ تنہائی نہیں
کہہ رہی ہے نزع کی اُلجھن تنِ رنجور سے
ہے یہ تمہیدِ وداعِ ہوش انگڑائی نہیں
آشنا تھے جس قدر سب ہو گئے نا آشنا
اس طرح جیسے کسی سے بھی شناسائی نہیں

رحم کر اے چارہ سازِ خستہ حالاں رحم کر
اب دلِ بیتاب کو تابِ شکیبائی نہیں

بسترِ غم پر مریضِ عشق کروٹ لے سکے
جسمِ ناطاقت میں اتنی بھی توانائی نہیں

کیا وہ جسمِ زار جو مجموعۂ آزار ہو
ضعفِ دل، ضعفِ جگر، یا ضعفِ بینائی نہیں

سخت جانی اِن مصائب کا تحمل تا بہ کے
دوسری اب آ رہی ہے اک بلا آئی نہیں

وادیٔ غربت سے تا سرحدِ صحرائے عدم
عشق تو نے کس سے کس سے خاک چھنوائی نہیں

ڈرتے ہیں بدنامیوں سے عاشقانِ خامکار
پختہ مغزانِ جنوں کو خوفِ رسوائی نہیں

اِس خراباتِ جہاں میں رہ کے آخر کیا کریں
جب موافق اپنے دَورِ چرخِ مینائی نہیں

تم سمجھتے ہو کہ دنیا ایک اچھی چیز ہے
میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی اچھائی نہیں

زندگی کا ماحصل کیا ہے بتادوں میں صفیؔ
انتظار اُس کا ابھی تک جو بلا آئی نہیں

۱۹۳۶ء

راہِ طلب میں رہرو کو رانہ جا رہے ہیں
نقشِ قدم برابر آنکھیں دکھا رہے ہیں

سُو بھی گئے وہ لیکن، ہم ہیں کہ اپنی رَو میں
دُکھ درد کی کہانی اُن کو سُنا رہے ہیں
اس باغِ بے ثمر میں اک سلسلہ ہے جاری
مشتاق آرہے ہیں محرُوم جا رہے ہیں
انجام پر گلُوں کے شبنم جو رُو رہی ہے
رنگیں مزاج غنچے کیا مُسکرا رہے ہیں
یہ بھی صفیؔ ہے اُن کی ناآزمودہ کاری
سَو بار آزما کر پھر آزما رہے ہیں

دَورِ دوم سنہ ۱۸۸۴ء

بس دل وہی دماغ وہی ہے خدا گواہ
جس میں کسی کی یاد کسی کا خیال ہو
کیونکر کہوں ملے گی قیامت کے روز داد
شاید وہاں بھی کوئی نہ پُرسانِ حال ہو

سنہ ۱۸۸۵ء

خلق کرنا تھا غمِ عشق کے قابل مجکو
جتنے تھے داغ نہ کیوں اتنے دیے دل مجکو
غمِ کونَین کا پا کر متحمّل مجکو
دے دیا ساتھ ہی دردِ جگر و دل مجکو
در پہ اک تفرقہ انداز کے ہنگامہ ہے
ڈھونڈھتا ہوں میں اِدھر دل کو اُدھر دل مجکو

چاہیے ظرفِ تحمّل بھی بہ اندازۂ درد
سیکڑوں غم تھے تو کیوں ایک دیا دل مجکو

نگرانی دلِ بیداد نے کی آٹھ پہر
یاد سے تیری نہ پایا کبھی غافل مجکو

جلوۂ شاہدِ مقصود نمایاں ہے صفی
نظر آتا ہے چراغِ سرِ منزل مجکو

سنہ ۱۸۸۷ء

خاک کا پیوند افسردہ کوئی مجھ سا نہ ہو
سنگِ قبر اپنا اگر ٹوٹے شرر پیدا نہ ہو

حق رسی ہم بیکسوں کی حشر پر موقوف ہے
خوف ہے لیکن یہی عالم کہیں اُس جا نہ ہو

دل دُکھاؤ شوق سے ہر دم پر اتنا سوچ لو
خوگرِ ایذا یہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو

اتفاقِ باہمی سے کیوں کنارہ کش ہے دل
بے حقیقت ہے جو قطرہ شاملِ دریا نہ ہو

نکلی جاتی ہے صفی پیروں کے نیچے سے زمیں
آسماں یوں بھی کسی کے درپئے ایذا نہ ہو

سنہ ۱۸۸۷ء

جلوہ گاہِ یار اپنا خانۂ دل کیوں نہ ہو
عشقِ صادق ہے جہاں پھر جذبِ کامل کیوں نہ ہو

اُٹھ رہے اے شیخ کیوں جنت پہ شغلِ میکشی
جو وہاں ہوگا یہیں وہ لطف حاصل کیوں نہ ہو
بیقراری میں کٹی ہو عمر جس کی مثلِ موج
اس کے چہرے سے عیاں بیتابیٔ دل کیوں نہ ہو

۱۸۸۹ء

ایک ہی ہوگا مرے خوابِ پریشاں کا اثر
جس قدر چاہو مجھے دوستو، تعبیریں دو
کوہکن بخت ترا اور صفیؔ کی قسمت
نہ پھریں ہاتھ نہ پھرنا تھیں یہ تقدیریں دو

۱۸۸۹ء

دوستی میں صلح دشمن آپ کا ایسا تو ہو
دور رنج ایسا تو ہو دیر آشنا ایسا تو ہو
آہ کا جوش اے دلِ درد آشنا ایسا تو ہو
پھر نہ ملنے پائے لب سے لب جدا ایسا تو ہو
ہنس کے بھر دیجے گُلِ اُمید سے دامانِ زخم
ہو شہیدِ ناز راضی خونبہا ایسا تو ہو
دُور سے پہچان کے وہ پھیرتا ہے مجھ سے مُنہ
آشنا ایسا تو ہو، نا آشنا ایسا تو ہو
جب زباں پر آئے دل محفوظ ہو جائے صفیؔ
ثمرۂ نخلِ قلم میں کچھ مزا ایسا تو ہو

سنہ ۱۸۸۹ء

سلوک ایسا تو کر دنیا میں جس سے نام روشن ہو
چراغِ راہ بن جا دوست اِس میں ہو کہ دشمن ہو

کیا برباد میرے دل کو اِس شوقِ محبت نے
خدا حافظ ہے اُس وادی کا جس میں خضر رہزن ہو

بقدرِ ذوقِ بے تابی نہیں دونوں جگہ وسعت
برابر ہے مجھے اے دل قفس ہو یا نشیمن ہو

صفیؔ بیٹھے ہوئے کیا کر رہے ہو کنجِ عزلت میں
اُٹھو چل کر شریکِ صحبتِ یارانِ ہم فن ہو

دورِ ششم سنہ ۱۹۲۵ء

ایک مدّت ہوئی گو طور کے افسانے کو
آج تک شمع جلا دیتی ہے پروانے کو

کشتۂ عشق ہی کا زندۂ جاوید ہے نام
زندگی کیوں نہ کہیں بات پہ مرجانے کو

دیکھ کر شیخ و برہمن میں کشاکش باہم
لے لیا کعبے نے آغوش میں بُتخانے کو

تنگ ہے تنگ، یہ معمورۂ ہستی ہم پر
جائیں آباد کریں اب کسی ویرانے کو

ذکرِ شق القمر آیا تو صفیؔ ساقی نے
توڑ کر جوڑ دیا حسن سے پیمانے کو

۱۹۲۵ء

صلاحیں تھیں یہ دیوانوں میں غافل پا کے درباں کو
چلو زنجیر سے زنداں کی ناپ آئیں بیاباں کو

ابھی کچھ خندۂ گل کی صدا آتی ہے کانوں میں
ترے وحشی نے شاید چاک کر ڈالا گریباں کو

بتا اے ضبطِ غم دیں اب کسے الزامِ رسوائی
دلِ خوں گشتہ کو یا دیدۂ خونابہ افشاں کو

فلک کی آنکھ سے آنسو گرا تارا نہیں ٹوٹا
چراغ اک چاہیئے تھا ظلمتِ گورِ غریباں کو

یہ گلزارِ ارم دلکش خیاباں در خیاباں ہے
صفیؔ چل پھر کے دیکھو اپنے اسلامی گلستاں کو

۱۹۲۶ء

جانا جانا جلدی کیا ہے، ان باتوں کو جانے دو
ٹھہرو ٹھہرو، دل تو ٹھہرے، مجکو ہوش میں آنے دو

پاؤں نکالو خلوت سے، آئے جو قیامت آنے دو
سیارے سر آپس میں، ٹکرائیں اگر ٹکرانے دو

مہرِ منوّر جامِ طلائی ماہ کٹورا چاندی کا
چرخ کے خم خانے میں یہی ہیں، گردش میں پیمانے دو

دورِ بہارِ حسن تو ہو، پھر جوشِ جنوں کا قحط نہیں
کوکے گی باغوں میں کوئل، بور آموں میں آنے دو

بادل گرجا، بجلی چمکی، روئی شبنم پھول ہنسے
مرغِ سحر کو ہجر کی شب کے افسانے دُہرانے دو

ہاتھ میں ہے آئینہ و شانہ پھر بھی شکن پیشانی پر
موجِ صبا سے تم تو نہ بگڑو زلفوں کو بل کھانے دو

کثرت سے جب نام و نشاں ہے کیا ہوں گے گمنام صفی
نقش دلوں پر نام ہے اپنا نقشِ لحد مٹ جانے دو

دَورِ ہفتم ۱۹۳۳ء

دکھائے گا درِ صیاد شاید آسماں مجکو
قفس معلوم ہوتا ہے چمن میں آشیاں مجکو

جواہر خانۂ فطرت کا اک انمول موتی ہے
دلِ روشن ملا ہے جو بطورِ ارمغاں مجکو

دلوں پر اس طرح چھایا ہوا ہوں اہلِ معنی کے
سمجھتی ہے زمینِ شعر اپنا آسماں مجکو

بہ حُسنِ صوت گو مرغوب ہے طرزِ غزل خوانی
نہ لیکن یوں کہ سمجھیں اک مغنّی نکتہ داں مجکو

صفی شعر و سخن کی صحبتوں سے کیا مجھے مطلب
پکڑ لائے ہیں جا کر ناطقِ شیوا بیاں مجکو

دورِ ششم سنہ ۱۹۲۷ء

شیشوں کی طرح ٹوٹے توبہ سرِ میخانہ
ساقی پھر اُسی کن سے اک لغزشِ مستانہ
اک اک سے اُلجھتا ہے اپنا ہو کہ بیگانہ
پوچھو نہ روش دل کی دیوانہ ہے دیوانہ
اسبابِ تغیّر ہے آرائشِ ہستی ہے
کچھ دن کہیں آبادی کچھ دن کہیں ویرانہ
جب قیدِ تعیّن سے اے دل ہے بری کوئی
سنگِ رہِ مقصد ہے کعبہ ہو کہ بُت خانہ
دورِ مئے عشرت سے کیا کام صفی ہم کو
جب عمر ہی کا اپنی لبریز ہے پیمانہ

دورِ ہفتم سنہ ۱۹۳۴ء

بفیضِ صحبتِ ساقی دلانِ میخانہ
بدل گیا ہے صفی زندگی کا پیمانہ
بنا دیا ہے تحیّر نے مجکو دیوانہ
طلسمِ ہوشربا ہے یہ آئینہ خانہ
جہاں جہاں نہیں انساں بمعنیِ انساں
مری نظر میں وہ آبادیاں ہیں ویرانہ
نظارہ جوئے بہارِ مجازِ رنگارنگ
نگارخانہ ہستی میں دل حریفانہ
زمانہ یونہی اُلٹتا رہے گا روز ورق
جو آج واقعہ ہے کل وہ ہوگا افسانہ
حباب و قطرۂ موجِ یم و کفِ سیلاب
یہ سب ہیں ایک مگر صورتیں جداگانہ
الگ الگ بھی ہے پھر ساتھ ساتھ بھی سایہ
صفی کہو اِسے اپنا کہوں کہ بیگانہ

دَورِ دوم سنہ ۱۸۸۹ء

وہیں نکلی نہ کوئی صلح کی صورت یہیں نکلی
گئے دیر و حرم میں جب تو بحثِ کفر و دیں نکلی

لحد میں چین سے سویا کیے ہم پاؤں پھیلائے
بڑی گنجائش اے اہلِ جہاں زیرِ زمیں نکلی

ترے گیسو سے جب آئی شمیمِ جانفزا آئی
تری چتون سے جب نکلی ادائے دلنشیں نکلی

وہ اک تم ہو تمنّا پوچھتے ہو کس کو کہتے ہیں
وہ اک ہم ہیں ہوس دل کی کوئی ابتک نہیں نکلی

صفیؔ نازاں حریفانِ سخن تھے دست و بازو پر
جو وقتِ امتحاں آیا تو خالی آستیں نکلی

سنہ ۱۸۸۹ء

ہے کیفیت ہی دِگرگوں کچھ آج چتون کی
لڑی ہے دوست سے شاید نگاہ دشمن کی

طیور چپ ہیں پریشاں ہوا ہے گلشن کی
علامتیں ہیں یہ بربادیٔ نشیمن کی

چراغ طور کی پھیلی ہے روشنی سرِ راہ
کلیم کیوں نہ کریں سیر دشتِ ایمن کی

کہاں بڑھے ہوئے جاتے ہیں چاکِ پیراہن
صفیؔ خبر یہ گریباں کو دیں نہ دامن کی

دَورِ سوم سنہ ۱۸۹۱ء

کرتی ہے آئینہ بندی خود نمائی آپ کی
جلوہ گاہِ ناز ہے ساری خدائی آپ کی

شرم آلودہ نگہ مست شرابِ ناز ہے
رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے پارسائی آپ کی

بیٹھ کر اک روز جلسے میں مے و معشوق کے
شیخ صاحب دیکھ لیں گے پارسائی آپ کی

اک صفیؔ کیا حیرت افزا ہے سبھی کے واسطے
آئینہ سازِ دو عالم خود نمائی آپ کی

سنہ ۱۸۹۱ء

تو کبھی ناز سے چلتا ہے جو اُو فتنہ خرام
وہی رفتار قیامت ہے قیامت کیسی

دَورِ چہارم سنہ ۱۹۰۴ء

بندِ نقابِ حُسن ابھی وا کرے کوئی
جذبِ نگاہِ شوق تو پیدا کرے کوئی

فکرِ مزا جدائیِ مجنوں فضول ہے
پہلے ادا شناسیِ لیلیٰ کرے کوئی

جب آنکھ بند کر کے بھی ممکن ہے دیدِ یار
پھر کیوں نگاہِ شوق کو رسوا کرے کوئی

آئینہ زارِ حیرتِ مجنوں ہیں دشت و در
کب تک تصورِ رخِ لیلا کرے کوئی

دن رات کلفتوں کے سوا کچھ نہیں جہاں
اُس غمکدے میں رہ کے صفی کیا کرے کوئی

سنہ ۱۹۰۵ء

دیکھ لیتا اک نظر اس کے سوا حسرت نہ تھی
دیکھنے آتا کوئی ایسی مری قسمت نہ تھی

میری مُشتِ خاک اُڑائی آسماں نے اس طرح
جیسے تربت ہر جگہ تھی پھر کہیں تربت نہ تھی

رازِ طولِ زندگانی کیا بتاتے وہ غریب
خضر بیچارے جنھیں مرنے کی بھی فرصت نہ تھی

معترف ہوں میں تو قدرت کی ظرافت کا صفی
دی وہ جنسِ ناروا جس کی کوئی قیمت نہ تھی

سنہ ۱۹۰۶ء

آہ وہ رات جو بسر نہ ہوئی
ہم تڑپتے رہے سحر نہ ہوئی

کیوں شبِ انتظار کیا ہوگا
اتفاقاً اگر سحر نہ ہوئی

ہو، جو دل کا لہو ہوا پانی
آنسوؤں سے جب آنکھ تر نہ ہوئی

اپنی حالت پہ کچھ نظر کرتے
عمر بھر مہلت اس قدر نہ ہوئی

شعر گوئی ہے اور صفی تعطیل
ہوئی فرصت ہمیں مگر نہ ہوئی

سنہ ۱۹۰۷ء

فلک تک ہم نے مانا آہ میں قوت ہے جانے کی
مگر فرصت کہاں اِس غمکدے میں سر اُٹھانے کی
بنا ہے اک بُتِ بدمست کی خلوت کا آئینہ
وہی دل تھی ودیعت جس میں کیفیت زمانے کی
نظر آیا چمن میں جب کوئی کِھلتا ہوا غنچہ
ادا یاد آ گئی ہم کو کسی کے مسکرانے کی
کہیں میں کیوں نہ ہوں رہتی ہے دُھن کوئے محبت کی
میری بھکی ہوئی باتیں بھی ہوتی ہیں ٹھکانے کی
چراغ نام روشن کر کے رہتے تو کہاں رہتے
صفیؔ ہم سے ہوا ہی ناموافق تھی زمانے کی

سنہ ۱۹۰۸ء

ملتے ہی آنکھ دل پہ قیامت گذر گئی
جادو بھری نگاہ صفیؔ کام کر گئی
تم نے تو امتحان لیا تیغِ ناز کا
بیکار اک شہیدِ محبت کے سر گئی
رگ رگ میں خون، خوب ہوا، خشک ہوگیا
تشویشِ دجلہ رہزیٔ زخمِ جگر گئی
اچھا ہوا کہ زخمِ جگر تو بگڑ گیا
وہ آٹھ دن کی سرزنشِ بخیہ گر گئی

پیری میں اب محاسبۂ عمر کیا صفی
تھوڑی سی رہ گئی ہے بہت سی گذر گئی

سنہ ۱۹۱۰ء

آہ دل ہی میں جو تو رہ جائے گی
شرحِ داغِ آرزو رہ جائے گی

دی نگہ نے آئینے کو گر شکست
کیا تمھارے روبرو رہ جائے گی

اے ہجومِ غم نہ دے دل کو فشار
آرزو ہو کر لہو رہ جائے گی

یہ جہانِ رنگ و بو ہو گا فنا
ہستیٔ بے رنگ و بو رہ جائے گی

دیر کو پہونچے جو میخانے صفی
بیعتِ دستِ سبو رہ جائے گی

دَورِ ششم سنہ ۱۹۲۴ء

زندگی مجھ پر شکستہ کی، اسیرِ دام کی
یوں تو میری چیز ہے لیکن مرے کس کام کی

دُور ہوں لیکن یہ سودا ہے اُنھیں کے پاس ہوں
دیکھئے گا پختگی میرے خیالِ خام کی

دُور بینِ فطرتِ محدود سے دشوار ہے
معرفت اک ذاتِ بے آغاز و بے انجام کی

مونسِ شب بیکسی اور بیخودی دن بھر رفیق
صبح کی مایوسیوں میں، غفلتوں میں شام کی

دل ہو شیشہ، ہاتھ پیمانہ، مئے اخلاص کا
ورنہ لفظی بادہ پیمائی صفیؔ کس کام کی

۱۹۲۴ء

کوچۂ جاناں میں تربت، مل گئی
سر زمینِ باغِ جنت، مل گئی

اُن سے مل کر ہو گیا دل بے نیاز
جیسے دنیا بھر کی دولت، مل گئی

چرخ سے اتنی کسے اُمید تھی
زندگی میں جتنی مہلت، مل گئی

راہ چلتے جب کوئی ٹھوکر لگی
ہم یہ سمجھے اک نصیحت، مل گئی

دیکھ کر میری نظر کا رُخ صفیؔ
خضر کو راہِ ہدایت، مل گئی

۱۹۲۸ء

حکمِ آزادی نہ پایا زندگی برباد کی
مدتیں گذریں نگاہیں دیکھتے صیاد کی

قبر ہے ہر زندہ دل کے واسطے قیدِ رسوم
موت ہے جب سلب آزادی ہوا یک آزاد کی

اشک بھر آتے ہیں سیاحوں کی آنکھوں میں صفیؔ
قبر ہے گورِ غریباں میں یہ کس ناشاد کی

۱۹۳۰ء

صفائے قلب ہی دولت ہے اہلِ جوہر کی
بجز آبرو نہیں کچھ بھی گرہ میں گوہر کی

ہوا گمان اُسی شوخِ سست پیماں کا
اگر ہوا سے بھی زنجیر ہل گئی در کی

ہوائے غم سے مکدّر ہیں دل کے آئینے
اُس انجمن میں یہ صورت ہے اہلِ جوہر کی

خضر نے دے کے کچھ آبِ حیات کے چھینٹے
یہ کیا کیا کہ تلف عمر کی سکندر کی

ازل سے تا بہ ابد کیا سمائے نظروں میں
یہ انجمن ہے فقط ایک دورِ ساغر کی

عبورِ بحرِ حقیقت سے جب نہیں ممکن
کنارے بیٹھ کے لہریں گنو سمندر کی

کہے گا کون سنی جائے گی صفیؔ کس سے
تمھاری رام کہانی یہ زندگی بھر کی

دورِ ہفتم ۱۹۳۳ء

محض تخئیل نہ سمجھے اسے حاشا کوئی
پھر نیا بھیس بدلنے کو ہے دنیا کوئی

صحنِ عالم میں ہر اک سمت ہے رقصِ بسمل
دور سے دیکھ رہا ہے یہ تماشا کوئی

کس مپرسی کا وہ عالم کہ الٰہی توبہ
دم بھی نکلے تو نہیں پوچھنے والا کوئی

دُور کیوں جاؤ ذرا اپنی ہی حالت دیکھو
مست امروز کوئی سرخوش فردا کوئی

کیوں کریں شکوۂ بے مہری احباب صفیؔ
اب وہ دل ہی نہیں جس میں ہو تمنّا کوئی

سنہ ۱۹۳۵ء

پتا میرا پتا دے کاش بڑھ کر آرزو میری
مری ناکامیوں کو دیر سے ہے جستجو میری

سمجھ کر وہ گدائے رہ نشیں مجھ سے مخاطب تھے
غبارِ خاکساری نے بڑھا دی آبرو میری

ہوئے خود حضرتِ پیرِ مغاں شامل مریدوں میں
یہاں تک رنگ لائی بیعتِ دستِ سبو میری

نبھے کس طرح راہ و رسم الفت جب یہ عالم ہے
ادائیں فتنہ خواں کی طبیعت صلح جو میری

صفیؔ پیری میں یہ سیر و سفر یہ موسم سرما
خجل ہے دیکھ کر سرگرمیاں سیر الہو میری

دَورِ ہشتم سنہ ۱۹۴۲ء

سودائے زلیخا کی تصویر نظر آئی
پائے مہ کنعاں میں زنجیر نظر آئی

یہ زندگیِ فانی اک خواب کا منظر ہے
جب بند ہوئیں آنکھیں تعبیر نظر آئی

آئینے کا ہر ٹکڑا ہے مستقل آئینہ
وحدت ہی کی کثرت میں تنویر نظر آئی

اک شکل بگڑتی ہے جب دوسری بنتی ہے
تخریب کے پردے میں تعمیر نظر آئی

رکھا نہ صفی ہم نے دنیا سے علاقہ کچھ
جب شہرِ خموشاں میں جا گیر نظر آئی

دَورِ پنجم

سنہ ۱۹۱۲ء

کہاں تک ہو خوشی کے ساتھ ہی وابستگی غم کی
ذرا شیرازہ بندی دیکھئے اجزائے عالم کی

تلوّن ہے مزاجِ یار تجھ میں کس قیامت کا
بدلتی رہتی ہے فہرست موجوداتِ عالم کی

صفی ہم کو زمانے سے شکایت ہے تو اتنی ہے
ہماری زندگی میں قدر کی لیکن بہت کم کی

سنہ ۱۹۱۸ء

کیونکر یہاں تمھاری طبیعت بہل گئی
اتنی ہی زندگی ہمیں اے خضر مل گئی

بیساختہ اک آہ جو منھ سے نکل گئی
اللہ رے انقلاب کہ دنیا بدل گئی

جب ایک روز جان کا جانا ضرور ہے
پھر فرق کیا وہ آج گئی خواہ کل گئی

ممنون ہوں جہاں کے نشیب و فراز کا
اکثر بگڑ کے خود مری حالت سنبھل گئی

ذکرِ زبانِ آتش مرحوم کیا صفی
اک شمع تھی جو نور کے سانچے میں ڈھل گئی

سنہ ۱۹۱۹ء

زمانہ ہو گیا باغِ محبت کی تباہی کو
ابھی تک ہیں وہی گلکاریاں خونِ شہیداں کی

سنہ ۱۹۱۹ء

دیکھئے کیوں، کوئی تربت ہو گی — دیکھ کر اور ندامت ہو گی
جب حنائے سرِ ناخن تھا شباب — شیب کی اب یہی رنگت ہو گی
زنگ آلودہ اک آئینہ سہی — دل کی آخر کوئی قیمت ہو گی
دل میں رہ رہ کے کھٹک ہوتی ہے — خلشِ دردِ محبت ہو گی
ہوں گی اُتنی ہی نگاہیں بیچین — جس قدر شوخ طبیعت ہو گی
دل میں رکھیں تو کدورت کہلائے — منھ سے نکلے تو شکایت ہو گی

زہر ہے زہر صفیؔ آبِ حیات
زندگی بڑھ کے مصیبت ہو گی

دَورِ دوم سنہ ۱۸۸۲ء

کل ہم آئینے میں رُخ کی جھرّیاں دیکھا کئے
کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے
زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اُجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے
بستیاں ویراں ہوئیں آباد ویرانے ہوئے
شعبدے تیرے یہی اے آسماں دیکھا کئے

سادگی کی انتہا کر دی عزیزانِ چمن
مدّتوں رنگِ مزاجِ باغباں دیکھا کئے

ہم تھے اک آئینۂ عبرت کسی کی بزم میں
مہرباں دیکھا کئے نامہرباں دیکھا کئے

جب اسیرِ دام ہو کر ہم چلے سوئے قفس
دُور تک مُڑ مُڑ کے اپنا آشیاں دیکھا کئے

چشمِ ہمدردی صفی جن سے تھی وہ بیٹھے ہوئے
سیلِ خوں، افسوس آنکھوں سے رواں دیکھا کئے

سنہ ۱۸۸۵ء

بتا اے بیخودی کس کے لئے ہوں نوحہ گر پہلے
شہیدِ نازِ قاتل دل ہوا ہے یا جگر پہلے

نگاہِ شوق پر اپنی مجھے خود رشک آتا ہے
پہنچ جاتی ہے مجھ سے یار تک میری نظر پہلے

صفی یہ نظمِ تر سلکِ گہر سے بیش قیمت ہے
خریداری کو اِس کی چاہئے لیکن نظر پہلے

سنہ ۱۸۸۶ء

غمِ ہر نیک و بد سے میکشانِ سر گراں چھوٹے
بہت سستے مُریدِ حضرتِ پیرِ مغاں چھوٹے

ہے اتنا یاد بزمِ دلستاں میں ساتھ لائے تھے
نہیں معلوم ہم سے حضرتِ دل پھر کہاں چھوٹے

سنہ ۱۸۸۷ء

ضعف میں کرتا ہوں کب قطع مسافت پاؤں سے
نکلی جاتی ہے زمینِ راہ غربت پاؤں سے

سنہ ۱۸۸۹ء

طاقت ہو تو وحشت میں ادھر جائے اُدھر جائے
جب پاؤں میں ہو ضعف کی زنجیر کدھر جائے
تا گلشنِ حسنِ رخِ رنگیں جو نظر جائے
نظارے کا دامن گلِ اُمید سے بھر جائے
ہوتا ہے بُرے وقت میں کب کوئی کسی کا
کچھ غم نہیں دل ہاتھ سے جاتا ہے اگر جائے
معلوم ہوا ہنسنے کا انجام ہے رونا
آنسو نکل آئیں جو ہنسی حد سے گذر جائے
دامن کو جھٹک کر کہا یہ روح نے تن سے
ہمراہ وطن میں نہ مرے گردِ سفر جائے
انسان ہر اک شخص سے پیش آئے بہ نیکی
مانے کہ نہ مانے کوئی اپنی سی تو کر جائے
اس درجہ بھی کیا خنجرِ قاتل میں نہیں آب
خالی یہ مری عمر کا پیمانہ نہ ہی بھر جائے
کچھ دن ہی سے ہے ہجر کی شب دل کو تلاطم
اللہ کرے خیر سے یہ رات گذر جائے

حاسد سے کہو کلکِ صفیؔ کبر شکن ہے
نشۂ مئے نخوت کا چڑھا ہو تو اُتر جائے

سنہ ۱۸۸۹ء

چشمِ آبدیدہ کیوں ہے دلِ زار کے لئے
اچھا نہیں شگون یہ بیمار کے لئے

مستوں کو شیخ دیکھ کے مسجد کا پٹ نہ بھیڑ
توبہ کا در کھلا ہے گنہ گار کے لئے

کیا فائدہ جو دوست کو دشمن بنائیے
کیوں یار سے بگاڑیے اغیار کے لئے

دلکش ہے کتنی شوخیِ طرزِ خرامِ ناز
فتنہ اُٹھا قدم تیری رفتار کے لئے

نظمِ صفیؔ تو سلکِ دُرِ شاہوار ہے
لیکن نظر ہے شرط خریدار کے لئے

سنہ ۱۸۸۹ء

دل ہے تو یادِ نرگسِ مستانہ ساتھ ہے
ہر لحظہ اپنے شیشۂ و پیمانہ ساتھ ہے

سنہ ۱۸۸۹ء

کشتیِ مے کے موافق وہ ہوا رہتی ہے
جس سے چھائی ہوئی دریا پہ گھٹا رہتی ہے

خلد ملنے کی تو امید بر آئے گی وہاں
خوفِ دوزخ سے یہیں روح فنا رہتی ہے

دل سے جاتی تو نہیں ہے خلشِ درد مگر
کبھی کم اور کسی وقت سِوا رہتی ہے
بے نصیب ایسا ہوں روزی مرے سائے کی طرح
ہے مرے ساتھ مگر مجھ سے جُدا رہتی ہے
صؔفی اب دُور کرو کھوئے ہوئے دل کا خیال
جانے والی ہو جو شَے پاس وہ کیا رہتی ہے

سنہ ۱۸۹۰ء

میری ہی طبیعت نہیں کچھ آئی ہوئی ہے
اس رخ پہ تری زلف بھی لہرائی ہوئی ہے
بلبل کی ہوا خواہ نہ بن بادِ بہاری
یہ آتشِ گل تیری ہی بھڑکائی ہوئی ہے
رازِ گل و بلبل کی خبر تھی نہ کسی کو
یہ بات صبا تیری ہی پھیلائی ہوئی ہے
گلشن میں بہار آئے خزاں آئے ہمیں کیا
ہے ایک کلی دل کی وہ مُرجھائی ہوئی ہے
ہو رخنوں سے پُر کیوں نہ صفؔی دل کی عمارت
تیرِ نگہِ ناز کی برمائی ہوئی ہے

سنہ ۱۸۹۰ء

دل سے کبھی مٹنے کا نہیں داغِ محبت
دھبا یہ نگینے میں ہمارے جگر ہی سے ہے

گُل بھی ہوا خواہ ہے بلبل کی بھی دمساز
چالاک قیامت کی نسیمِ سحری ہے

دورِ سوم سنہ ۱۸۹۴ء

وہ اور کچھ نہ سہی لطفِ انتظار تو ہے
کہ غیر کو ترے وعدے کا اعتبار تو ہے

تری جفا پہ ہو ترکِ وفا یہی کیا فرض
کہ جبرِ دل پہ کریں ہم یہ اختیار تو ہے

سنہ ۱۸۹۵ء

نویدِ مرگ ہے عشاق نیم جاں کے لئے
کہ تیغِ یار ابھی ہے پھر امتحاں کے لئے

ہمیں تو موت سے بدتر ہے زیست بے احباب
یہ خضر ہی سے ہوا عمرِ جاوداں کے لئے

صفی بیان کروں کس زباں سے لذّتِ درد
مزہ یہ دل کے لئے ہے نہ یہ زباں کے لئے

سنہ ۱۸۹۶ء

صدمۂ ہجر بہ اُمّیدِ وصال اچھا ہے
جس کے آخر میں خوشی ہو وہ ملال اچھا ہے

غیر کے دل میں اگر ہے یہ ملال اچھا ہے
کہ تمھارا مری جانب سے خیال اچھا ہے

دل کا غمخوار ہر اک رنج میں راحت میں شریک
بیوفا تجھ سے کہیں تیرا خیال اچھا ہے
جانکنی ہو کہ وہ بیتابیٔ دل ہو کچھ ہو
جس پہ ظالم تجھے رحم آئے وہ حال اچھا ہے
ماجرائے دلِ بیمار ہے ناگفتہ بہ
اب مزاج آپنے پوچھا ہے تو حال اچھا ہے
بس یہی ہے سخنِ خوب کی پہچان صفیؔ
جس کو اچھا کہیں اربابِ کمال اچھا ہے

سنہ ۱۸۹۷ء

دل کو جو نذرِ دیدۂ خونبار کر چکے
وہ رازدارئ غمِ دلدار کر چکے

سنہ ۱۸۹۹ء

وہاں بالوں میں کنگھی ہو رہی ہے خم نکلتا ہے
یہاں رگ رگ سے کھنچ کھنچ کر ہمارا دم نکلتا ہے
الٰہی خیر ہو اُلجھن پہ اُلجھن بڑھتی جاتی ہے
نہ میرا دم نہ اُن کے گیسوؤں کا خم نکلتا ہے
قیامت ہی نہ ہو جائے جو پردے سے نکل آؤ
تمھارے مُنہ چھپانے میں تو یہ عالم نکلتا ہے
نگاہِ التفاتِ مہر اور اندازِ دلجوئی
مگر اک پہلوئے بیتابئِ شبنم نکلتا ہے

صفی کشتہ ہوں ناپرسانیوں کا اہلِ عالم کی
یہ دیکھوں کون میرا صاحبِ ماتم نکلتا ہے

سنہ ۱۸۹۹ء

رنگ ساقی کا جما ہے سرخوشی کا جوش ہے
میکدے میں ہر طرف گلبانگِ نوشانوش ہے

دیدنی ہے دَورِ ساغر بھی مگر کیا کیجئے
آنکھ کھولے بزمِ ساقی میں یہ کِس کو ہوش ہے

تجھ کو نالوں میں اثر بھرنا تو آتا ہی نہیں
ورنہ اے بلبل یہاں ہر گُل سراپا گوش ہے

لی تھی انگڑائی خمارِ بادۂ دیدار میں
یہ نہ سمجھے تھے کہ تمہیدِ وداعِ ہوش ہے

اک ذرا شوخی تو دیکھو حُسنِ جاناں کی صفی
سب کو اک جلوہ دکھا رکھا ہے خود روپوش ہے

سنہ ۱۸۹۹ء

خونِ ناحق مرا سفاک بلا سے ہوگا
تیری تلوار کے جوہر تو چمک جائیں گے

سنہ ۱۹۰۰ء

محشر میں جا کے آخر کیا داد خواہ کرتے
کہتا اسی کی ایسی جس کو گواہ کرتے

تھے دفترِ عمل کے مختار حضرتِ دل
چاہے سفید کرتے چاہے سیاہ کرتے

بے التفاتیوں کا دل ہو گیا ہے خوگر
ایجاد اور کوئی طرزِ نگاہ کرتے

طولِ امل سے حاصل، دو دن کی زندگی ہیں
کیا فکرِ مال کرتے کیا حبِ جاہ کرتے

وہ تربتِ صفی پر اچھا ہوا نہ آئے
محشر خرامیوں سے عالم تباہ کرتے

سنہ ۱۹۰۰ء

ستمکش آپ کے اس ڈر سے زہر کھا نہ سکے
یہی کہے گا زمانہ کہ ناز اُٹھا نہ سکے

خموش بیٹھ جہاں جم کے بیٹھ مثلِ نگیں
کہ تجھ کو تیری جگہ سے کوئی اُٹھا نہ سکے

فرو ہوئی نہ حرارت جگر کی رونے سے
لگی تھی آگ کچھ ایسی کہ ہم بُجھا نہ سکے

نکل ہی جائے گا خاطر سے رفتہ رفتہ ملال
کسی کی یاد نہیں یہ جو دل سے جا نہ سکے

برنگ نقش قدم شاہراہِ ہستی میں
وہاں پہ بیٹھ جہاں سے کوئی اُٹھا نہ سکے

کسی نشانِ لحد کو مٹا رہے ہو اگر
تو یوں مٹاؤ کہ پھر آسماں مٹا نہ سکے

اُبل پڑے میری آنکھوں سے بن کے گرم آنسو
وہ آبلے جو دلِ تنگ میں سما نہ سکے

صفی خفا وہ خوشامد سے ہوتے ہیں کچھ اور
اسی لئے کہ جو روٹھیں کوئی منا نہ سکے

سنہ ۱۹۰۰ء

بھلا حصولِ تمنا کی جستجو کیا ہے
جو زندگی میں بر آسئے وہ آرزو کیا ہے

نظر فریب نہیں گر کسی کا جلوۂ حسن
یہ آب و تاب ہے کیسی یہ رنگ و بو کیا ہے

زباں دراز ہے نشتر دہن دریدہ ہے زخم
یہ ردّ و قدح بہم وقتِ گفتگو کیا ہے

یہ نورِ چشم وہ پروردۂ کنارِ صدف
زیادہ اشک سے گوہر کی آبرو کیا ہے

جب اس کی بوند کہیں گر پڑی دھواں اُٹھا
گداز شیشۂ دل ہے صفی لہو کیا ہے

سنہ ۱۹۰۰ء

سب خونِ دل کا چاہے آنکھوں کی راہ نکلے
اتنا مگر نہ چھیڑو منھ سے جو آہ نکلے

اعضائے مضمحل نے عصیاں سے باز رکھا
بدخواہ تھے جو اپنے وہ خیر خواہ نکلے

گردش پہ آسماں کی ہم نے جو کچھ نظر کی
اکثر لباسِ شب میں روزِ سیاہ نکلے

چمکے زمین کا بھی اسے مہرباں ستارا
پردے سے آپ نکلیں گردوں پہ ماہ نکلے

دل پر صفی اثر ہو جس کا وہی سخن ہے
تعریفِ شعر یہ ہے خود منھ سے واہ نکلے

دورِ چہارم سنہ ۱۹۰۱ء

دمِ آخر تو یارب حسرتِ لطفِ ستم نکلے
وہ تیرِ نیمکش کھینچیں مرے سینے سے دم نکلے
کسی نے جانچ کی جب سینہ ریشانِ محبت کی
ہمیں سب سے زیادہ کشتۂ ذوقِ ستم نکلے
یہ افسانہ نہیں اک سرگذشتِ شمعِ سوزاں ہے
شہیدانِ وفا سر دے کے بھی ثابت قدم نکلے
بڑھا سن جس قدر گھٹتا گیا اتنا ہی وزن اپنا
صفی تولے گئے جے مرتبہ پہلے سے کم نکلے

سنہ ۱۹۰۳ء

خانۂ دل داغِ حسرت سے چراغاں کر چکے
کوئی آئے یا نہ آئے ہم تو ساماں کر چکے

سنہ ۱۹۰۵ء

پہلے دل مبتلا کیا میں نے — اب پشیماں ہوں کیا کیا میں نے
بحرِ ہستی میں کشتیِ دل کا — عشق کو ناخدا کیا میں نے
دل نے درد آشنا کیا مجکو — دل کو صبر آزما کیا میں نے

زور دستِ جنوں میں تھا جتنا صرف چاکِ قبا کیا میں نے
صورتِ شبنم اپنے دل کو صفی
مستِ ذوقِ فنا کیا میں نے

۱۹۰۶ء

یوں دل ہو خون شرحِ تمنا کہیں جسے
ٹپکے وہ قطرہ آنکھ سے دریا کہیں جسے

لائی ہے دل سے تا بمژہ، اک نگاہِ یاس
سامان صد ہزار تمنا کہیں جسے

چھوٹا نہ دامنِ دلِ غربت نصیب سے
وہ ایک داغِ گرد کہ صحرا کہیں جسے

اے عشق بزمِ حسن میں کر عرضِ مدعا
لیکن نہ اس طرح کہ تقاضا کہیں جسے

اللہ ری بے حجابیٔ حسنِ نظارہ سوز
وہ بھی نہیں نگاہ کا پردا کہیں جسے

اے آہِ دل گداز کہیں دیکھ مٹ نہ جائے
وہ نقشِ آرزو کہ سویدا کہیں جسے

باقی ہے ایک آرزوِ مرگِ ناگہاں
اب اپنی زندگی کا سہارا کہیں جسے

تخمِ نشاطِ کار ہے ہر قطرۂ شراب
نخلِ بہارِ عیش ہے مینا کہیں جسے

کوئی بُرا کہے تو نہ مانو بُرا صفیؔ
اچھا وہی ہے شعر سب اچھا کہیں جسے

سنہ ۱۹۰۶ء

طوفاں اُٹھے کہ شورِ قیامت بلند ہو
ہم تو جہازِ عمر کا لنگر اُٹھا چکے
دیکھا تو آفتابِ قیامت بلند تھا
جب مستِ ناز ہاتھ میں ساغر اُٹھا چکے
کی چرخ نے تلافیٔ ایامِ غم تو کیا
وہ داغ کب مٹیں گے جو دل پر اُٹھا چکے

سنہ ۱۹۰۶ء

ہزار بار جو اے دم لبوں پہ تو آئے
محال ہے کہ وہ شوخ بہانہ جو آئے
تڑپ تڑپ کے کٹی کشتۂ فراق کی رات
نہ موت ہی اسے آئی نہ چارہ جو آئے
شہیدِ ناز کے مدفن کی ہے یہی پہچان
اٹھا کے خاک جو سونگھیں لہو کی بو آئے
دیا نصیب نے یہ اَوج خاکساری میں
میرے غبار کے ذرّے فلک کو چھو آئے
بچھائیں گے صفتِ جام مغبچے آنکھیں
جو میکدے میں صفیؔ مدظلہ آئے

۱۹۰۷ء

پھول تو پھول سیرِ گلشن میں
کوئی کانٹا بھی ہم کچل نہ سکے

۱۹۰۷ء

نہیں حیرت کدۂ حسن میں قحطِ دیدار
آئنے جلوہ فروشِ رخِ جاناں ہوں گے

دیکھ لو تم بھی تماشا نہ یہ دیکھا ہوگا
آج کچھ اہلِ جنوں داخلِ زنداں ہوں گے

۱۹۰۸ء

جس جگہ بیٹھ گئے نقش جما کے اُٹھے
اُٹھے جس بزم سے ہنگامہ اُٹھا کے اُٹھے

جس جگہ بیٹھ گئے جا کے ترے دیوانے
اپنے ساتھ اوروں کو دیوانہ بنا کے اُٹھے

اُن کا پھر نام و نشاں کون مٹا سکتا ہے
جو زمانے سے خود اپنے کو مٹا کے اُٹھے

شگفتہ جاں وہ ہیں صفی ہم کہ بقولِ مومن
جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اُٹھے

۱۹۰۹ء

وفا پہ ہیں مرتے وفا کرنے والے   جفا کر رہے ہیں جفا کرنے والے

ابھی ہے بتوں کو خدائی کا دعویٰ
خدا جانے ہیں اور کیا کرنے والے

سنہ ۱۹۰۹ء

اُدھر ساقی کو عذرِ لغزشِ مستانہ آتا ہے
اِدھر مَیں خوش کہ اب آتا ہے اب پیمانہ آتا ہے
کششِ ہے حسُن کے جلوے ہیں یارب کس قیامت کے
قریبِ شمع کھنچ کر دُور سے پروانہ آتا ہے
کہاں تک ہے نہیں معلوم حسُن وعشق کی دُنیا
سُنو جس سے اُسی کو اک نیا افسانہ آتا ہے
کہیں رکھتا ہے پڑتا ہے قدم لیکن کہیں جاکر
نہیں معلوم کس دُھن میں ترا دیوانہ آتا ہے
نہیں موقوف فصلِ گل پہ یہ ہنگامہ آرائی
کہ جب آتا ہے دل جیسے کوئی دیوانہ آتا ہے
طلسمِ خاک کو دیکھو ذرا چشمِ تامّل سے
نظر پردے میں آبادی کے اک ویرانہ آتا ہے
صفیؔ کنجِ لحد میں ہوں اسیرِ قیدِ تنہائی
یگانہ کوئی آتا ہے نہ یاں بیگانہ آتا ہے

سنہ ۱۹۰۹ء

خرامِ ناز ترا انتظار راہ میں ہے
کسی کی نعش ابھی بے مزار راہ میں ہے
دلِ شکستہ ہے آئینہ زارِ حسُنِ صنم
اس ایک شمع کا پرتو ہزار راہ میں ہے

دلِ غریب کی آشفتگی ہے آئینہ
تباہ صورتِ مشتِ غبار راہ میں ہے

مسافرانِ عدم سیر دیکھتے جاؤ
نمائشِ چمنِ روزگار راہ میں ہے

نکل پڑے درِ زنداں کو توڑ کر وحشی
سنا یہ جب کہ نسیمِ بہار راہ میں ہے

نظر فریب ہے ان کے شہیدِ ناز کی خاک
گلوں کا رنگ شریکِ غبار راہ میں ہے

مٹا دیا مجھے ظاہر پرستیوں نے صفی
بلائے جاں نگہِ اعتبار راہ میں ہے

سنہ ۱۹۰۹ء

پیوندِ خاک کس کو مری جاں کئے ہوئے
آتے ہو آج سر بہ گریباں کئے ہوئے

دکھلا رہا ہے سوزِ غمِ ہجر کیا بہار
داغوں سے دل کو سروِ چراغاں کئے ہوئے

سودائے زلفِ یار سے ہیں منتشر حواس
جیسے طیورِ شب کو پریشاں کئے ہوئے

جس بزمِ ناز کی ہے دلِ آشفتہ بوئے گل
ہم بھی ہیں اک وہیں کے پریشاں کئے ہوئے

اک جلوہ گاہِ ناز میں جاتا ہوں اب صفی
جاں نذرِ بے نیازیِ جاناں کئے ہوئے

سنہ ۱۹۱۰ء

نگاہِ لطف سے پرسش جو چارہ جو کرتے
نحیف و زار اشاروں میں گفتگو کرتے
تھکے ہوئے ہیں مگر کچھ پتا اگر چلتا
دلِ غریب تیری اور جستجو کرتے
مسیح و خضر کا انجام کیا نہیں معلوم
کس اعتبار پہ جینے کی آرزو کرتے
ہمیں نسیمِ محبت نے پائمال کیا
وہ ہمدموں سے گئے جو ستم عدو کرتے
حریم ناز میں اُو چھُپ کے بیٹھنے والے
شکستہ پا تیری کس طرح جستجو کرتے
یہ کس شہیدِ محبت کی قبر ہے یا رب
ہزاروں اہلِ دل آتے ہیں جستجو کرتے
حریمِ دیرِ مغاں تک اگر پہونچ جائے
صفی، پرستشِ پیمانہ و سبو کرتے

سنہ ۱۹۱۰ء

سب وہ ماتھے پر شکن بن کر اُبھرتے جائیں گے
اِس دلِ نازک پہ جو صدمے گذرتے جائیں گے
دل پہ یہ بیٹھا ہوا ہے اِک بُتِ کافر کا نقش
ہم خدا کے سامنے بھی ڈرتے ڈرتے جائیں گے

آنے والے آ چکے کب تک یہ طولِ انتظار
رات بڑھتی جائے گی گیسو سنورتے جائیں گے

پھر کے ہستی سے عدم تو جائیں گے لیکن صفیؔ
منزلیں کتنی ہیں جن میں ہم ٹھہرتے جائیں گے

دَورِ پنجم سنہ ۱۹۱۱ء

جس قدر اجزائے دل فرقت میں جلتے جائیں گے
نبض سے اے چارہ گر شعلے نکلتے جائیں گے

خاک، پردے سے ترے کب تک شہیدانِ وفا
یوں لباسِ لالہ و گُل میں نکلتے جائیں گے

چشمِ وحشت کی نگاہِ گرم اگر پڑتی رہی
آہنی زنجیر کے حلقے پگھلتے جائیں گے

دیکھ لیجے گا شہیدانِ وفا کی خاک سے
خون کے چشمے قیامت تک اُبلتے جائیں گے

نالے نکلیں گے صفیؔ جتنا اثر میں ڈوب کر
تازہ رس نخلِ محبت اور پھلتے جائیں گے

سنہ ۱۹۱۱ء

غیر کی بزم میں درکار ہیں ساغر کے لئے
گردشیں کم نہ پڑیں میرے مقدر کے لئے

سعی بے سود ہے اصلاحِ مقدر کے لئے
کیا ہوا خضر کی کوشش سے سکندر کے لئے

شکر محرومیٔ قسمت، کہ بھری محفل میں
آنکھ نیچی ہوئی ساقی سے نہ ساغر کے لئے

رہنے دے اے دلِ سوزاں کہ لگا رکھی ہیں
خون کی چند یہ بوندیں مژۂ تر کے لئے

کیجئے گرم یہیں شوق سے ہنگامۂ ناز
کیوں اُٹھا رکھئے اسے عرصۂ محشر کے لئے

نہ اُڑا خونِ شہیدانِ وفا کا جب رنگ
دل نے تجویز کیا دامنِ محشر کے لئے

زندگانی میں جہاں اور بلائیں ہیں صفیؔ
اک بلا فکرِ سخن بھی ہے میرے سر کے لئے

سنہ ۱۹۱۱ء

جب تک کہ دل ہے دل میں تری آرزو رہے
شل ہوں جو تھک کے پاؤں عنانِ جستجو رہے

ہے عذر خواہِ گرمیٔ ہنگامۂ نشاط
دل کیا کرے کہ جب نہ رگوں میں لہو رہے

کیا اضطراب تھا کہ الٰہی تمام رات
بے چین میرے ساتھ میرے چارہ جو رہے

وہ بادۂ نشاط کی تیزی کہ دو ہی گھونٹ
تا مرگ وجہ تلخیٔ کام و گلو رہے

اُس در پہ ہم سے خاک نشینوں کا ہے یہ قول
دُنیا میں چاہیے کچھ نہ رہے آبرو رہے

زود آشنائیوں کا بُرا ہو کہ ہم صفی
تا مرگ شکوہ سنج فریبِ عدو رہے

سنہ ۱۹۱۲ء

گھٹا اٹھی ہے کالی اور کالی ہوتی جاتی ہے
صراحی جو بھری جاتی ہے خالی ہوتی جاتی ہے

چمن میں پھول وہ صبحِ بہاراں چُنتے پھرتے ہیں
گلوں کی بے تکلف گو شمالی ہوتی جاتی ہے

زمانہ ہے ترقی یا تنزل کا خدا جانے
کمالِ فن ہیں پیدا بے کمالی ہوتی جاتی ہے

کبھی لطف و کرم ہے اور کبھی جور و ستم اُن کا
عیاں شانِ جمالی و جلالی ہوتی جاتی ہے

شبِ وعدہ تصور میں ہوئی جاتی ہیں بند آنکھیں
مگر آراستہ بزمِ خیالی ہوتی جاتی ہے

یہ بہتر ہے غمِ پنہاں صفی کیوں آشکارا ہو
بہت کم دیکھو چہرے کی بحالی ہوتی جاتی ہے

سنہ ۱۹۱۳ء

کیا تم نے وعدہ اور تم شبِ انتظار آئے
مجھے اعتبار آئے کہ نہ اعتبار آئے

اگر اس طرح ملے بھی تو بتاؤ کیا ملے وہ
کبھی مدتوں نہ آئے کبھی بار بار آئے

کسے اعتبار ایسے نفس گریز پا کا
جو ہزار بار جائے جو ہزار بار آئے
نہ شرر تھے ہم نہ شبنم مگر اتفاق یہ بھی
کہ اس انجمن میں لے کر دلِ بیقرار آئے
سرِ راہ خاک اُڑاؤ مگر اک ذرا سمجھ کر
کسی دل کے آئینے پر نہ صفیؔ غبار آئے

۱۹۱۵ء

یہ دردِ عشق نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا اس دل سے
کہ موت آئے گی آسانی سے دم نکلے گا مشکل سے
سرِ منزل تو پہونچے ہاتھ دھو بیٹھے مگر دل سے
سفینہ غرقِ دریا ہو گیا ٹکرا کے ساحل سے
ذرا اک دور ہو جانے دو پھر دیکھیں گے کیفیت
نگاہیں جو ابھی نا آشنا ہیں رنگِ محفل سے
نگاہیں جذب کر لیتی ہیں اندازِ محبت کو
یہ بجلی دل پہ گرتی ہے جہاں نکلی کسی دل سے
بتا اے مرگ بے ہنگام اُن کا حشر کیا ہوگا
جو اُمیدیں کہ وابستہ ہیں اک ٹوٹے ہوئے دل سے
پلٹ کر عمرِ رفتہ کو صفیؔ آواز دیتا ہوں
نکل آیا ہوں اپنی رَو میں اتنی دُور منزل سے

۱۹۱۵ء

کس طرح دیکھئے زنداں میں قضا آتی ہے
روشنی آتی ہے جس میں نہ ہوا آتی ہے

خون ہو کر بھی نہ بدلا دلِ بیتاب کا رنگ
سانس لیتا ہوں جہاں بوئے وفا آتی ہے

میرے پہلو میں ٹھہر جائے تڑپتا ہوا دل
تجکو ظالم کوئی ایسی بھی ادا آتی ہے

رات بھر خواب پریشاں نظر آتے ہیں صفی
نیند کیا آتی ہے گویا کہ بلا آتی ہے

۱۹۱۷ء

ٹپکے کبھی، کبھی مژہ تر کے ہو گئے
قطرے مرے لہو کے اسی گھر کے ہو گئے

دل بھی جگر سے کم نہ رہا دردِ عشق میں
دونوں یہ حصہ دار برابر کے ہو گئے

ذاتِ شریف حضرتِ واعظ ہیں کیا بزرگ
منبر پہ بیٹھنا تھا کہ منبر کے ہو گئے

جتنے ستارے ڈوب کے اُبھرے نہ پھر کبھی
وہ سب شریک میرے مقدر کے ہو گئے

خانہ بدوش صورتِ نقشِ قدم صفی
بیٹھے جہاں پہ جا کے اُسی در کے ہو گئے

سنہ ۱۹۱۹ء

دیا ہے پیرِ خرابات نے یہی فتویٰ
نہ دست رس ہو جسے بیعتِ سبو نہ کرے

سنہ ۱۹۲۰ء

یوں واقعاتِ عمر فراموش ہو گئے
گویا ہم ایک ہستیٔ خاموش ہو گئے
سننا تھا میرا نام کہ خاموش ہو گئے
اللہ ایسے زود فراموش ہو گئے
دیکھا نہ جب دعائے قدح میں کوئی اثر
رندانِ پاکباز قدح نوش ہو گئے
شعلے بھڑک رہے تھے نہ پروانہ تھا نہ شمع
جس وقت حسن و عشق ہم آغوش ہو گئے
پہونچا کے تا بہ منزلِ اوّل تمہیں صفیؔ
ہم بارِ معصیت سے سبکدوش ہو گئے

سنہ ۱۹۲۰ء

پھریں ہیں یوں پتلیاں شبِ غم کہ شام ہی سے سحر ہوئی ہے
مگر نہ آنا تھا وہ نہ آئے اِدھر کی دنیا اُدھر ہوئی ہے
کھلے تو بابِ قبول کیونکر کہ معصیت قفلِ در ہوئی ہے
دعائیں کس منہ سے مانگتے ہم زبان ہی بے اثر ہوئی ہے
وہ جوشِ بیتابیٔ شبِ غم وہ ہر طرف بیکسی کا عالم
کٹی ہے آنکھوں میں رات ساری تڑپ تڑپ کر سحر ہوئی ہے

بتا دے ایذائے سخت جانی مرے مقدر میں کیا لکھا ہے
یونہی بسر ہوگی زندگانی کہ جیسے اب تک سحر ہوئی ہے
وہ اُٹھ گئے سب جو تھے شناسا اب انجمن میں ہوں اجنبی سا
صفیؔ زمانے سے رفتہ رفتہ مغائرت کس قدر ہوئی ہے

سنہ ۱۹۲۰ء

ایک سجدے سے غرض ہے وہ یہاں ہو یا وہاں
بتکدے چلئے در کعبہ اگر معمور ہے
پیچھے پیچھے ہم ہیں رخ ہے جانب بزم حبیب
آگے آگے دست موسیٰ میں چراغِ طور ہے

سنہ ۱۹۲۰ء

بغل میں داب کے ناقوس اک اذاں کے لئے
چلا ہوں کعبے پرستاری بتاں کے لئے
کمال ہی سے ہے دنیا میں گرم بازاری
متاع شرط ہے آرائش دُکاں کے لئے
حجاب سینہ میں دل، دل میں روح روح میں عشق
یہ اہتمام اور اک مشت استخواں کے لئے
چمن میں چھوٹ کر آئے ہیں کچھ اسیر قفس
مقام ڈھونڈھتے پھرتے ہیں آشیاں کے لئے
صفیؔ تغیر عالم بتا رہا ہے کہ ہے
خزاں بہار و بہار چمن، خزاں کے لئے

دورِ ششم

۱۹۲۵ء

تجھ کو خلوت میں بٹھایا تری یکتائی نے
زندہ در گور بنایا مجھے تنہائی نے

اسے کہتے ہیں وفا قبر میں بھی ساتھ گئی
مجھ کو چھوڑا نہ اکیلا شبِ تنہائی نے

حسرتِ دید میں مر بھی گئے مرنے والے
بات پوچھی نہ مگر نازِ مسیحائی نے

دامنِ تر یہ سمجھتا تھا نہ آنچ آئے گی
مگر اک آگ لگا دی مری رسوائی نے

دل میں اُس شوخ کی تصویر نہ ہوتی جو صفیؔ
قبر میں گھیر لیا تھا غمِ تنہائی نے

۱۹۲۵ء

کیا کروں اب جو عطا ساغرِ جم ہوتا ہے
وقت وہ ہے کہ مسرت سے بھی غم ہوتا ہے

دل کے اجزائے پریشاں کو حقارت سے نہ دیکھ
کہیں صدیوں میں یہ سرمایہ بہم ہوتا ہے

رہبرِ وادیٔ ایمن کو دکھاتی ہے چراغ
رہگذر جس میں ترا نقشِ قدم ہوتا ہے

۱۹۲۵ء

فلک سے ٹوٹ کے تارا گرے کہ شعلۂ برق
کوئی تو شمع جلانے سرِ مزار آئے

سنہ ۱۹۲۵ء

سرمہ ہیں چشمِ دل کے لئے تلخ تجربے
پیری نے کر دیا ہے وسیع النظر مجھے
اپنے چمن کے پھولوں میں کانٹوں کا رنگ ہے
اچھا ریاضتوں کا ملا یہ ثمر مجھے

سنہ ۱۹۲۵ء

اپنے ہی دل پر نہ دم بھر ہاتھ رکھ کر دیکھئے
نبضِ بیمارِ محبت کیوں مکرر دیکھئے
بند کیں آنکھیں جہاں دیکھا نہ دیکھا ایک تھا
اک نظر دنیا کو چاہے زندگی بھر دیکھئے
روئیے کیوں کاروانِ نکہتِ برباد پر
حالتِ آوارگانِ کوئے دلبر دیکھئے
حضرتِ واعظ ملے تھے کل جو میخانے کے پاس
جلوہ افروز آج ہیں بالائے منبر دیکھئے
سامنے آنکھوں کے ہے آئینۂ عبرت صفی
کس طرح دم توڑتے ہیں اہلِ جوہر دیکھئے

سنہ ۱۹۲۵ء

بختِ برگشتہ کی میرے نارسائی دیکھنا
ڈھونڈھتا تھا راہبر کو مل گیا رہزن مجھے

۱۹۲۵ء

بے زباں کہنے میں قابو میں نہ اب آواز ہے
سازِ ہستی ہمدمو بگڑا ہوا اک ساز ہے

بزمِ عشرت کا وہ نغمہ جن پر ان کو ناز ہے
غالباً ٹوٹے ہوئے دل کی مرے آواز ہے

میرے افسانے نے خاموش اہلِ دل کو کر دیا
بزم پر چھائی ہوئی پُر درد اِک آواز ہے

جب نظر آئی بساطِ کہکشاں ہنگامِ شب
میں یہی سمجھا کسی کا فرش پا انداز ہے

طور پر جا کر صدائے لن ترانی بھی سُنی
آپ کی آواز سے ملتی ہوئی آواز ہے

کیوں پلٹ آئے نہ سر ٹکرا کے فریادِ صفی
ہر نفس سے رشتہ بر پا طائرِ آواز ہے

۱۹۲۶ء

جب دل نہ پریشاں ہو جمعیتِ ساماں ہے
ہر غنچۂ نورس کی مٹھی میں گلستاں ہے

افسانۂ یوسفؑ میں تصویر کے دو رُخ ہیں
اک دست بداماں ہے اک سر بہ گریباں ہے

ہر شعلۂ جوالہ ہمرنگِ گل و لالہ
قدموں سے مرے دوزخ فردوس بداماں ہے

آکر جو نہیں جاتی وہ ہے شبِ تنہائی
جا کر جو نہیں آتی وہ عمر گریزاں ہے

توبہ کے برابر ہے توبہ شکنی میری
اک ہاتھ میں پیمانہ اک ہاتھ میں قرآں ہے

باتوں میں صفیؔ دل کی زنہار نہ آنا تم
باطن میں یہ کافر ہے ظاہر میں مسلماں ہے

سنہ ۱۹۲۶ء

زلیخا کر نہ گستاخی بہت یوسفؑ کے داماں سے
حجاب آئے گا آگے بڑھ کے اپنے ہی گریباں سے

فضا آبادیوں کی تنگ دیوانوں پہ ہے اُن کے
یہیں جب جی بہلتا ہے تو کیوں جائیں بیاباں سے

سراپا زخم ہوں ہر زخم میں اک شمع روشن ہے
مگر وہ ہیں کہ جی بھرتا نہیں سیرِ چراغاں سے

نسیمِ صبح گل افشاں ہے تم بھی قبرِ بیکس پر
کبھی چادر چڑھا دو سایۂ سروِ خراماں سے

گل آئیں شمع آئے چاندنی آئے نسیم آئے
وہ کیوں آئیں انھیں کیا واسطہ گورِ غریباں سے

بہت کچھ روکتا ہوں میں صفیؔ لیکن خدا جانے
مرے ہاتھوں کو ہے کیا دشمنی میرے گریباں سے

سنہ ۱۹۲۷ء

جب تم گرا چکے نظرِ اعتبار سے
کیا کام پھر تمھیں دلِ آشفتہ کار سے
ہوں اس چمن میں سبزۂ بیگانہ کی طرح
آویزشیں گلوں سے نہ کاوش ہی خار سے
اُن کا یہ حکم بیٹھ کے کوئی یہاں نہ روئے
عاجز ہم اپنے گریۂ بے اختیار سے

سنہ ۱۹۲۹ء

پر تولنے کے مُفت گنہ گار ہو گئے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہو گئے
جس خطۂ زمیں پہ گئے آپ کے قدم
فتنے تمام خواب سے بیدار ہو گئے

سنہ ۱۹۳۰ء

ہر چند لطفِ سیر و سیاحت سفر میں ہے
راحت ہے جس کا نام وہ اپنے ہی گھر میں ہے
کُنجِ قفس میں مرغِ گرفتار کے لئے
آبِ حیات موجِ نسیمِ سحر میں ہے
جو انقلاب آئے گا دنیا میں کل وہ آج
میری نظر میں ہے نہ تمھاری نظر میں ہے

سنہ ۱۹۳۰ء

کوئی آزاد ہے لذت کشِ گلگشتِ چمن
کوئی محبوسِ قفس حسرتِ پرواز میں ہے

سنہ ۱۹۳۰ء

غلط ہے دَور میں ساقی کے ہم تک جام آجائے
جو آجائے تو ہاں شاید برائے نام آجائے

دلِ صیّاد کیا ممکن تجھے آرام آجائے
اگر ہر طائرِ آزاد زیرِ دام آجائے

ستمکش بارگاہِ ناز میں ناحق ہیں فریادی
اُنھیں کے سر نہ ہر پھر کر کہیں الزام آجائے

حیاتِ چند روزہ کو حیاتِ جاوداں سمجھو
مگر اس وقت جب خلقِ خدا کا نام آجائے

صفیؔ حدِ ترقی سے تنزل کی علامت ہے
جب اپنی پختہ کاری کا خیالِ خام آجائے

سنہ ۱۹۳۰ء

تم جبر کرو جبر بھی وہ دل جو ہلا دے
ہم صبر کریں صبر کی توفیق خدا دے

یہ آگ وہ ہے خاک کو اکسیر بنا دے
دولت ہے غمِ عشق مگر جس کو خدا دے

روکے سے رُکیں گوشہ نشینانِ چمن خاک
جب جوشِ جنوں دعوتِ زندانِ بلا دے

یہ ہستیٔ موہوم ہے اک خوابِ پریشاں
اس خواب کی تعبیر کوئی خواب میں کیا دے
تدبیر کی عادت ہے کہ خود کام بگاڑے
تقدیر کا ناکردہ گنہ نام لگا دے
ہوگا طرب انگیز وہی ساز کہ جس میں
جو ایک صدا دے وہی ہر تار صدا دے
جمنے دو صفیؔ دل میں نہ تم گردِ کدورت
ایسا نہ ہو یہ بیچ میں دیوار اُٹھا دے

دَورِ ہفتم ۱۹۳۱ء

راحت جہاں ملے کوئی ایسا مکاں بھی ہے
دشمن مری زمین بھی ہے آسماں بھی ہے
منزل سے دُور چھوٹ گیا ہے کوئی غریب
ساتھی بھی نالہ کش جرسِ کارواں بھی ہے
اب یادِ صحنِ باغ و نشیمن سے کیا غرض
مدت سے جو قفس ہے وہی آشیاں بھی ہے
نورِ چراغِ دیر و حرم میں نہیں ہے فرق
جلوہ ہے ایک ہی جو یہاں بھی وہاں بھی ہے
فکرِ بقائے نامِ صفیؔ ہے خیالِ خام
جن جن کے نام ہیں کہیں اُنکا نشاں بھی ہے

سنہ ۱۹۳۱ء

جو میرا عقیدہ ہے وہ زاہد کا نہیں ہے
رحمت میں اُسے شک ہو مگر مجکو یقیں ہے

جس خاک سے پیدا ہوے اُس خاک پہ آخر
کیا حقِ تصرف تمھیں اے اہلِ زمیں ہے

جب مزرعِ عقبیٰ ہے یہ دنیا تو سمجھ لو
جنّت بھی یہیں اور جہنّم بھی یہیں ہے

بے لوث محبت ہو جسے مُلک سے اپنے
وہ برہنہ پا خسروِ بے تاج و نگیں ہے

سجادہ پرستوں سے تو بہتر ہے بہر کیف
مانا کہ صفیؔ رندِ خرابات نشیں ہے

سنہ ۱۹۳۱ء

فکروں نے جان لے لی اب جان ہی کہاں ہے
جو اک رمق ہے باقی وہ نذرِ دوستاں ہے

مانندِ شمع محفل سوزِ جگر ہے لب پر
میری زبان دل ہے دل ہی مری زباں ہے

وہ بھی کھٹک رہا ہے آنکھوں میں باغباں کی
کچھ خار و خس کہ جس پر بنیاد آشیاں ہے

سنہ ۱۹۳۱ء

اپنے برتاؤ کا ہے ردِّ عمل — دوستی کیا ہے دشمنی کیا ہے
جز فریبِ نظر نہیں کچھ بھی — جس کو سمجھے کہ ہے وہی کیا ہے

۱۹۳۱ء

جب دارِ عدم سے ہستی میں گمنام آئے ناکام چلے
یہ آنا بھی کوئی آنا ہے یہ جانا بھی کوئی جانا ہے

۱۹۳۲ء

اس آئینے میں تصویرِ بتاں ہے
مرا دل کعبۂ ہندوستاں ہے
کہاں کشتی رُکے ساحل کہاں ہے
زمانہ ایک بحرِ بیکراں ہے
کہاں جائیں ٹھکانا ہی کہاں ہے
زمیں دشمن مخالف آسماں ہے
خدا کا شکر اس حالت کو پہونچے
کہ وہ نامہرباں بھی مہرباں ہے
بڑے ہی شوق سے وہ سُن رہے ہیں
خدا معلوم کس کی داستاں ہے
قفس دم سے اسیروں کے ہے گلزار
چمن میں آشیاں ہی آشیاں ہے
صفیؔ صبحِ ازل شامِ ابد میں
حجابِ طولِ فرقت درمیاں ہے

۱۹۳۲ء

شب بھر ہم آہ جانبِ در دیکھتے رہے
وہ خوابِ ناز تا بہ سحر دیکھتے رہے

دیکھا نہ کچھ بھی آ کے جہانِ خراب میں
ہر سمت اک فریبِ نظر دیکھتے رہے

تھا کون بزم میں جو اُنھیں دیکھتا نہ ہو
پھر کیا قصور ہم بھی اگر دیکھتے رہے

اپنے حجابِ حسن پہ تم کو بہت ہے ناز
نا دیدہ لیکن اہلِ نظر دیکھتے رہے

دنیا میں رہ کے دیکھتے ہی اور کیا صفیؔ
ایک انقلابِ شام و سحر دیکھتے رہے

۱۹۳۲ء

محفل میں اُسے دیکھ بھی سکتے نہیں ڈر سے
ظالم کو عداوت ہے محبت کی نظر سے

چلتا ہے بہت راستہ ہستی و عدم کا
آتا ہے اُدھر سے کوئی جاتا ہے اِدھر سے

ہے حضرتِ واعظ کی نظر دونوں جہاں پر
مطلب کہ سمیٹیں کچھ اِدھر سے کچھ اُدھر سے

۱۹۳۲ء

بنائے ہستی ہے نیستی پر مگر تمھیں کچھ خبر نہیں ہے
یہ گلشنِ رنگ و بو ہے کیا شئے اگر فریبِ نظر نہیں ہے

نہ ڈھونڈھیے مرہمِ جراحت کہ رنج ہی میں ہمیں ہے راحت
ہمارے زخمِ دل و جگر کو ضرورتِ چارہ گر نہیں ہے

۱۹۳۲ء

رسومِ بندگیِ عشق یوں ادا کرتے
بتوں میں بیٹھ کے کچھ دن خدا خدا کرتے
نہ تھا جب اذن کہ ہم عرض مدعا کرتے
اگر خموش نہ رہتے تو کیئے کیا کرتے
بھلا قفس سے چمن تک پہونچتی کیا آواز
ہزار شور اسیرانِ خوش نوا کرتے
جسارتِ ہوسِ دید اسے معاذ اللہ
کلیم ہوش کی اپنے ذرا دوا کرتے
بچاتے لغزشِ پیہم سے کاتبِ اعمال
صفیؔ یہ حقِ رفاقت اگر ادا کرتے

۱۹۳۳ء

یہ جوش اسے نفسِ شعلہ بار رہنے دے
نہ کر نمائشِ برق و شرار رہنے دے
چمن کو بادِ صبا اس طرح نہ کر پامال
کوئی تو پھول سرِ شاخسار رہنے دے
پڑے ہوئے ہیں بہت سے گدائے راہ نشیں
ہمیں بھی کوئی سرِ رہگذار رہنے دے
بنا رہا ہوں نشیمن چمن میں رہنے کو
مگر جو گردشِ لیل و نہار رہنے دے

مرے کریم عبادت سے بے نیاز ہے تو
مجھے بتوں ہی کا طاعت گذار رہنے دے

یہی بہت ہے اگر دَورِ انقلاب صفیؔ
مٹا کے نام نشانِ مزار رہنے دے

۱۹۳۴ء

کانٹے بقدرِ وسعتِ داماں لئے ہوئے
پھرتا ہوں اپنے ساتھ بیاباں لئے ہوئے

چھیڑا تھا یوں ہی نشترِ مژگاں نے ایک بار
ابتک خلش ہے دل میں رگِ جاں لئے ہوئے

اہلِ جہاں سے اے دل اُمیدِ کرم نہ رکھ
ہر آستیں ہے دشنۂ پنہاں لئے ہوئے

آتا ہے کس حسیں کے نظارے کو صُبحدم
آئینہ ایک مہرِ درخشاں لئے ہوئے

آتی نہیں نظر مجھے پہونچی ہے اتنی دُور
لطفِ شباب عمرِ گریزاں لئے ہوئے

یہ رنگ اور یہ دعوئ اسلام اے صفیؔ
بوتل بغل میں ہاتھ میں قرآں لئے ہوئے

۱۹۳۴ء

کیا خوب دوستی کے فرائض ادا کئے
روتے رہے ہم اور وہ بیٹھے ہنسا کئے

کعبے میں نقشِ پائے صنم جب نظر پڑا
بے اختیار شکر کے سجدے ادا کئے

دامانِ چاک چاک گریبانِ تار تار
کیا کیا جنونِ عشق نے خلعت عطا کئے

دورِ ہشتم

۱۹۴۱ء

شکستہ سنگِ غم سے شیشۂ دل ہوتا جاتا ہے
نتیجہ سعیٔ لاحاصل کا حاصل ہوتا جاتا ہے

قدم رکھتے ہی اتنی دور پہونچی عمر کی کشتی
کہ اب مجھ سے بہت نزدیک ساحل ہوتا جاتا ہے

نفس کی آمد و شد پر مدارِ زندگانی تھا
مگر اب سانس کا لینا بھی مشکل ہوتا جاتا ہے

۱۹۴۲ء

مدّتیں گذریں کہ حسن و عشق میں ترکِ رسمِ نامہ و پیغام ہے

جب وہاں ہیں سب مرنجانِ مرنج
خلد میں واعظ کا پھر کیا کام ہے

۱۹۴۳ء

ڈر ہے مجھے اے عشق ترا حسنِ تکلّم
افسونِ محبت کو نہ افسانہ بنا دے

اے کاش کہ مٹّی مری ہو جائے سوارت
یارب اسے خاکِ درِ جانانہ بنا دے

وہ طرزِ تمدّن ہے صفیؔ موجبِ صد ننگ
دنیا کو جو بازیچۂ طفلانہ بنادے

سنہ ۱۹۴۴ء

دل میں سکت، نہ بوند لہو کی جگر میں ہے
نالے کی سادگی، کہ فریب اثر میں ہے

اللہ رے بزمِ حُسنِ ازل کی سجاوٹیں
ابتک وہ دلفریبیٔ منظر نظر میں ہے

ہرچند بے بہا ہے مگر جنسِ ناروا
سب سے بڑا یہ عیب متاعِ ہنر میں ہے

مجکو نہیں مجاز و حقیقت میں امتیاز
جو کچھ نظر سے دُور ہے وہ بھی نظر میں ہے

پیری کی صبح کب سے نمودار ہے صفیؔ
دل ہے کہ غرق لذّتِ خوابِ سحر میں ہے

سنہ ۱۹۴۵ء

خدا جانے خبر آئے نہ آئے — پلٹ کر نامہ بر آئے نہ آئے
ذرا آئینہ لانا دیکھ لوں شکل — جوانی پھر نظر آئے نہ آئے
نفس کی آمد و شد نا مقیّد — اُدھر جا کر اِدھر آئے نہ آئے
وفائے وعدۂ پیماں شکن کیا — وہ شوخِ حیلہ گر آئے نہ آئے
بھروسہ کیا صفیؔ اس بے وفا کا
نفس بارِ دگر آئے نہ آئے

———

۱۹۴۶ء

پیغام زندگی نے دیا موت کا مجھے
مرنے کے انتظار میں جینا پڑا مجھے
اس انقلاب کی بھی کوئی حد ہے دوستو
نا آشنا سمجھتے ہیں اب، آشنا مجھے
انسانیت یہ کہہ کے یہاں سے چلی گئی
راس آئے گی نہ ہند کی آب و ہوا مجھے
کشتی پہونچ سکے گی یہ تا ساحلِ مراد؟
دھوکا نہ دے خدا کے لئے ناخدا مجھے
وہ طولِ عمر جس میں نہ ہو لطفِ زندگی
مل جائے مثلِ خضر تو کیا فائدا مجھے
ہر داغ دل ہے مشہدِ صد خیلِ آرزو
کعبے میں آ رہی ہے نظر کربلا مجھے
تخلیقِ کائنات کو سوچا کیا مگر
کچھ ابتدا ملی نہ صفیؔ انتہا مجھے

۱۹۵۰ء

دل گرفتارِ بلا زلفِ گرہ گیر میں ہے
جس کو آزاد سمجھتے تھے وہ زنجیر میں ہے
ہر زمیں قصرِ فلک بوس کی دیتی ہے خبر
نقشِ تخریب نہاں پردۂ تعمیر میں ہے

دل مایوس نہ ہو اپنی دعا سے بدظن
دیر تھوڑی سی اگر جلوۂ تاثیر میں ہے
گو کہ پہلوئے خلش دو ہیں نتیجہ مگر ایک
تیر پیوست مرے دل میں کہ دل تیر میں ہے
وہی مرغوبِ طبیعت ہے صفیؔ کیا کیجے
حسنِ الفاظ جو معنی کدۂ میرؔ میں ہے

متفرقات

کیا کریں گے عمرِ خضر اتنے ہی دن رہ کر یہاں
خوب ہم کو امتحانِ اہلِ دنیا ہو گیا

اِدھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا   غرض آپ کو اِک نظر دیکھ لینا

جھپکی ہے طور پہ جب طالبِ دیدار کی آنکھ
دیکھ لیتا جو کوئی دیکھنے والا ہوتا

کی چشمِ تر نے اشک فشانی تمام رات
برسا ہے ٹوٹ ٹوٹ کے پانی تمام رات

تقریرِ نکیرین سے ہوگا خفقاں اور
انساں کی زباں اور فرشتوں کی زباں اور

یہ بزم میں نہیں جامِ شراب کو گردش
زمیں پہ ہے فلکِ آفتاب کو گردش

تم تو پہلے کمرِ عزمِ سفر پر باندھو
مل ہی جائیگا صفی راہنما ایک نہ ایک

ترجو ہے گریۂ شبنم سے طرحخانۂ گُل
یہ اشارہ ہے کہ لبریز ہے پیمانۂ گُل
باوجود اس کے کہ پائی ہے جگہ زیرِ قدم
کوئی سبزے سے زیادہ نہیں بیگانۂ گُل

تاجِ سُلطانی صفی رہتا تھا جن پر جلوہ گر
ٹھوکریں کھاتے ہیں ایسے کاسۂ سر سیکڑوں

کوئی تڑپے آپ بیٹھے دُور سے دیکھا کریں
لوگ اگر پوچھیں تو فرما دیجئے ہم کیا کریں

ہمنشینو! وہ خدنگِ ناز کا بسمل کہاں
ڈھونڈھتے ہو دل کو پہلو میں ہمارے دل کہاں
ہاں سکے کچھ دن تو لطفِ صحبتِ احباب اُٹھا
ورنہ اے دل پھر کہاں تو اور یہ محفل کہاں

کیا یہ کہتا ہے سمجھ میں کچھ مری آتا نہیں
چپ رہے ناصح کو اتنا کوئی سمجھاتا نہیں

نالاں برائے دل ہوں کہ بہرِ جگر ہوں میں
اک میں ہوں کس کے کس کے لئے نوحہ گر ہوں میں
بے دست و پا ہوں گو کہ مگر در بدر ہوں میں
گردش میں مثل کاسۂ دریوزہ گر ہوں میں

بگڑ بگڑ کے سنا رہے ہو چمن میں کیوں گلعذار باتیں؟
ہنسی پہ غنچوں کی تم نہ جاؤ ہزار منہ ہیں ہزار باتیں

شہیدِ نازِ بُتاں کُشتۂ ادا ہوں میں
نگاہِ لطف سے خواہانِ خوں بہا ہوں میں

یا الٰہی دور دورِ نرگسِ مستانہ ہو ہے اگر لبریز اپنی عمر کا پیمانہ ہو

کہاں تک انتظار آخر چلے آئیں جو آنا ہو
ابھی تک دم ہے آنکھوں میں نہیں معلوم پھر کیا ہو

وہ دل بتاؤ کرے کیا جو بے قرار نہ ہو شبِ فراق کوئی جس کا غمگسار نہ ہو
مزہ حیات کا ہی ہاتھ پاؤں چلنے تک خدا کرے کوئی محرومِ اختیار نہ ہو

یارب تڑپ رہا ہوں شرحِ غمِ نہاں کو
یا دے زبان دل کو، یا دل مری زباں کو
یارانِ رفتہ تم کو اُس کا سلام پہونچے
برباد کر چکے ہو جس گردِ کارواں کو

بھول کر بھی حُسنِ دلکش کا تماشائی نہ ہو
آدمی ہو جائے سودائی جو سودائی نہ ہو
دیکھ کر زندہ مجھے کیوں آپ ہیں چیں برجبیں
کس طرح مر جائے وہ جس کی قضا آئی نہ ہو

مجبول ہے سلام نہ لے جو اُٹھا کے ہاتھ
اتنی بھی کاہلی نہیں لازم ہے پا کے ہاتھ
یارب وہ کارساز ہے تو جس کے سامنے
دن رات پھیلے رہتے ہیں شاہ و گدا کے ہاتھ

ضو جتنی بڑھتی جاتی ہے شمعِ شعور کی
نزدیک ہوتی جاتی ہے ہر چیز دُور کی
آنکھیں ہیں بند غش میں دلِ ناصبور کی
کانوں میں آ رہی ہے کچھ آواز دُور کی

پھر ہم سنبھالتے ہیں دلِ ناشکیب کو
پھر آپ آزمائیے قوت نگاہ کی

کرتی ہے جذب قطرۂ شبنم شعاع مہر
دل کھینچتی ہے اُف رے کشش اُس نگاہ کی

حالت دلِ بیتاب کی ہیہات نہ پوچھی
تڑپا کئے ہم اس نے مگر بات نہ پوچھی

ہر سو اُس کا جلوہ گو عیاں ہے
برنگ بوئے گل، لیکن نہاں ہے
لحد میں ہو گئی کیا تیری صورت
سکندر دیکھ آئینہ کہاں ہے

خدا کی یاد میخواری میں بھی دل سے نہیں جاتی
کہ چاروں قُل مجھے یاد آتے ہیں مینا کی قلقل سے
حریصوں کو تو ہفت اقلیم کی دولت نہیں کافی
مزہ نانِ جویں کا پوچھئے اہلِ توکّل سے

بعد مرنے کے اگر چاہے بقائے شہرت
جیتے جی چاہیئے انساں کو فنا ہو جائے

وہ شوخ حلقۂ زلفِ سیاہ فام میں ہے
یہ سیر دیکھئے صیّاد اسیرِ دام میں ہے
مجھے مدام جو گردش ہے اب کھُلا مطلب
رقم نوشتۂ تقدیر خطِ جام میں ہے

رباعیات

لو سوے چراغ صبحگاہی نہ لگا
دل جز طرفِ یادِ الٰہی نہ لگا
پیری کو نہ دے خضاب سے رنگِ شباب
اے شیخ سفیدی میں سیاہی نہ لگا

طفلی بھی ہوئی آہ جوانی بھی تمام
پیری کا بھی ہوتا ہے یہی کچھ انجام
مائل سوے خاک ہے جو قدِ پرخم
اب ڈھونڈھ رہا ہے اپنی راحت کا مقام

بہتر کوئی شے اس سے زمانے میں نہیں
مثل اس کا خدا کے کارخانے میں نہیں
کیونکر نہ ہو بے نیاز کو عجز پسند
یہ جنس نفیس اس کے خزانے میں نہیں

ہمت اعضا تمام اب ہارے ہیں
بیکار حواس و ہوش بھی سارے ہیں
پیری کا اشارہ ہے کہ اٹھ صبح ہوئی
ہلتے ہوے دانت ڈوبتے تارے ہیں

ہر چند وہی دل ہے وہی ہیں آنکھیں
دل غنچہ صفت بند کھلی ہیں آنکھیں
عینک کے بغیر سوجھتا ہی نہیں کچھ
اب دیکھنے ہی دیکھنے کی ہیں آنکھیں

تقریرِ شباب و عُمرِ فانی کیا تھی
یہ بھی نہیں یاد وہ کہانی کیا تھی
غفلت سے کھُلی آنکھ تو معلوم ہوا
اک نیند کا جھونکا تھا جوانی کیا تھی

غم نقدِ حیات لوٹنے ہی کو ہے
یہ رشتۂ عمر ٹوٹنے ہی کو ہے
پیری میں کمر جھکی تو کیا دم کا قیام
اب تیر کماں سے چھوٹنے ہی کو ہے

روٹھا ہے شباب اس طرح تو ہم سے!
رکھا نہ تعلق اک سرِ مو ہم سے
پیدا شکنیں قدِ خمیدہ پہ ہوئیں
پیری بھی صفیؔ ہے چیں بہ ابرو ہم سے

کب راہروِ ملکِ عدم ٹھہریں گے
پہونچیں سرِ منزل تو قدم ٹھہریں گے
کہتے ہیں یہ پیری میں جگہ چھوڑ کے دانت
تو ہی ٹھہرے گا اب نہ ہم ٹھہریں گے

جان و دلِ صاحب نظراں ہے کوئی
اس پردۂ ہستی میں نہاں ہے کوئی
اُن کو بھی جنھیں ہے مرضِ کورئِ دل
انکار نہیں اس سے کہاں ہے کوئی

قطعۂ تاریخ اشاعت دیوان مولانا سید علی نقی صاحب صفی لکھنوی اعلی اللہ مقامہٗ

از نتیجۂ فکر جناب قدیر احمد خاں صاحب قدیرؔ تلمیذ جناب پیارے صاحب رشید لکھنوی خلد آشیاں

حق بجانب ہیں قصیدہ خوانِ مولانا صفی
ہند میں ہے جا بجا فیضانِ مولانا صفی

خدمتِ اُردو ادب میں صرف کردی زندگی
علم و فن دونوں پہ ہے احسانِ مولانا صفی

یہ صحیفہ جو مرتب کردۂ ممتاز ہے
خاص ہے منجملۂ سامانِ مولانا صفی

ہیں گلِ اشعار رنگا رنگ پھولوں کی طرح
گلشنِ بے خار ہے بُستانِ مولانا صفی

سیکڑوں نایاب نسخے آج تک محفوظ ہیں
ہے کتابوں سے بھرا ایوانِ مولانا صفی

شکر ہے سعیٔ عمل سے حضرتِ ممتاز کی
بعد مرنے کے چھپا دیوانِ مولانا صفی

حیف جیتے جی نہ شائع ہوسکا اُن کا کلام
دل کا دل ہی میں رہا ارمانِ مولانا صفی

کردیا ہے دوستی کا حق ادا ممتاز نے
ورنہ یوں تو ہیں بہت یارانِ مولانا صفی

مصرعۂ تاریخ ہجری اب رقم کردو قدیرؔ
مثلِ ممتاز ہے دیوانِ مولانا صفی

۱۳۷۲ھ